جام نور
February 2014
فرزندان اشرفیہ
آج بھی اہل باطل کے خلاف سینہ سپر ہیں

مشمولات

اللہ الرحمن الرحیم

بحرالاسرار ،قاسم الانوار ،قطب العرفا والعشاق

حضرت شاہ عبدالعلیم آسی غازی پوری

ولادت: ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۲ء - وفات: ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۷ء

کی روحانی، دعوتی اور علمی خدمات کے نام

گر قبول افتد زہے عزو شرف

ادارہ جام نور

ادارتی اپیل

اہل علم و دانش سے خصوصی گزارش

مکاتیب علامہ ارشد القادری کی تدوین وترتیب کا آغاز

قائد اہل سنت رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ کے خطوط کی تدوین وترتیب کے کام کا آغاز ہو چکا ہے- تمام علما، مشائخ، اہل دانش، تنظیموں، تحریکوں، مدرسوں کے ذمہ داران اور دیگر متوسلین سے گزارش کی جاتی ہے کہ جن کے پاس بھی حضرت قائد اہل سنت کے خطوط موجود ہوں وہ براہ کرم ان کی فوٹو کاپی کروا کر بذریعہ ڈاک یا اسکین کر کے بذریعہ ای میل درج ذیل پتے/ ای میل آئی ڈی پر اولین فرصت میں بھیج دیں-

نوٹ: وہ حضرات جن سے حضرت قائد اہل سنت کی مراسلت رہی اور اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے، ان کے صاحب زادگان اور متوسلین سے التماس ہے کہ وہ اس درخواست پر خصوصی توجہ فرمائیں اور مرحومین کے ریکارڈ فائل سے حضرت قائد اہل سنت کے خطوط بھیج کر اس اہم علمی کام میں تعاون فرمائیں-

امیدوار کرم

خوشتر نورانی

Jaam-e-Noor Monthly
422,Matia Mahal,Jama Masjid,Delhi-110006
email:jaamenoor@gmail.com
Mob:09871094760

ذیشان احمد مصباحی☆

دوسری قسط

مسئلہ اجتہاد و تقلید امام شعرانی کی نظر میں

المیزان الکبری الشعرانیة کے حوالے سے

بے ضرورت دوسرے مسلک پر عمل نہ کرے:

امام شعرانی کا میزان کبریٰ اور پیمانہ عظیم یہ ہے کہ شریعت کے تمام احکام میں شدت اور تخفیف دونوں پہلو ہیں، جو جس کا اہل ہو وہ اس پر عمل کرے-سوال یہ ہے کہ ایک شخص شافعی مسلک فقہ سے تعلق رکھتا ہے جن کا فتویٰ ہے کہ شرم گاہ کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اس نے اگر شرم گاہ کو مس کر لیا تو کیا اسے جائز ہے کہ اس مسئلے میں امام اعظم کے فتوے پر عمل کر لے، جو حکم تخفیف یا رخصت پر مبنی ہے، کیوں کہ ان کے فتویٰ کے مطابق شرم گاہ چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے- امام شعرانی فرماتے ہیں کہ شخص مذکور اگر دوبارہ وضو کرنے پر قادر ہے تو امام ابوحنیفہ کی تقلید کرتے ہوئے بے تجدید وضو نماز پڑھنا اس کے لیے روا نہیں ہے-اسی طرح اگر کوئی شافعی المسلک فاتحہ کی تلاوت پر قادر ہے تو اسے جائز نہیں کے بغیر تلاوت فاتحہ کے نماز پڑھ لے یا تلاوت قرآن پر قدرت ہوتے ہوئے ذکر الٰہی کرتے ہوئے نماز پڑھے، یہ بھی اس کے لیے جائز نہیں-(ص:۲۳)

امام شعرانی نے یہ بات لکھ کر اندھی غیر مقلدیت کی رگ کاٹ دی ہے، کیوں کہ امام شعرانی کی تحقیق کے مطابق جس طرح تقلید بے بصارت جائز نہیں، اسی طرح اجتہاد بے بصیرت بھی ممنوع و حرام ہے-

ائمہ کے فتاویٰ شخصی تھے نہ کہ عمومی:

امام شعرانی نے اس حقیقت کو سمجھانے پر پورا زور صرف کیا ہے کہ تمام ائمہ برحق ہیں- ان کے تمام اقوال وافعال برحق ہیں، جو شخص ان کے دلائل کو سمجھ لے اور یہ دیکھ لے کہ کون سا حکم عزیمت اور شدت کا ہے اور کون سا حکم رخصت اور خفت کا ہے اور وہ پھر اپنی حالت کا جائزہ لے لے کہ وہ عزیمت پر عمل کرنے کی قدرت رکھتا ہے یا نہیں، اس کے حق میں حضرت امام فرماتے ہیں کہ اگر عزیمت پر عمل کی قدرت رکھتا ہے تو وہ عزیمت پر ہی عمل کرے، اگر چہ اپنے امام کے خلاف جانا پڑے اور رخصت پر عمل کرنا اس کی مجبوری ہو تو رخصت پر ہی عمل کرے اگر چہ اپنے امام کے خلاف جانا پڑے اور بہر طور وہ حق وہدایت پر ہے نہ کہ فسق وضلالت پر-

یااخی ان کل من فعل الرخصة بشرطها اوالمفضول بشرطه فهوعلى هدى من ربه في ذالک ،ولولم يقل به امامه (ص:۲۰)

اے بھائی! جو شخص رخصت کی شرط کو ملحوظ رکھتے ہوئے رخصت پر عمل کرے یا مفضول کی شرط کی رعایت کرتے ہوئے مفضول پر عمل کرے تو وہ اپنے رب کی طرف سے اس معاملے میں ہدایت پر ہے، اگر چہ وہ اس کے امام کا قول نہ ہو-

ایک دوسرے مقام پر تو یہاں تک کہہ دیا:

ہر مقلد پر یہ اعتقاد رکھنا واجب ہے کہ اگر اس کے امام کے سامنے اس کی حالت رکھی جاتی جو عزیمت پر عمل کرنے سے قاصر ہے تو اگر چہ ان کا فتویٰ عزیمت کا ہے اب وہ رخصت کا فتویٰ دیتے، جو دوسرے امام کا قول ہے اور ایسا وہ دوسرے امام کی تقلید کی بنیاد پر نہیں کرتے بلکہ اس عاجز کے حق میں اپنے اجتہاد کی بنیاد پر کرتے-(ص:۳۳)

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ائمہ کے بارے میں ایک واجب الاعتقاد امر یہ ہے کہ وہ حضرات عبادات ومعاملات تمام ابواب فقہ میں ہر شخص کو اس کے مناسب حال تخفیف یا تشدید کا فتوی دیتے تھے- جس کو بھی اس معاملے میں ہم سے اختلاف ہو اس پر لازم ہے کہ ائمہ سے اس سلسلے میں کوئی صحیح روایت پیش کرے جس سے معلوم ہو کہ وہ لوگوں کو جو فتویٰ دیا کرتے تھے اسے ہر قوی وضعیف کے حق میں حکم عام سمجھتے تھے-(ص:۳۴)

یعنی کسی امام کا فتویٰ اگر عزیمت پر مبنی ہے تو اسے صرف اہل عزیمت کے حق میں سمجھا جائے اور اگر رخصت پر مبنی ہے تو اہل رخصت کے حق میں، ائمہ کے فتاویٰ کو حکم کلی کا درجہ نہیں دیا جاسکتا- ان کے فتاویٰ

سائل کی شخصی حالت کے حالت کے لیے ہیں نہ کہ عمومی حالات کے لیے-

فتویٰ بر مذاہب اربعہ:

> برادرم! یقین جانو کہ شریعت کا مطلوب ممکنہ حد تک اتفاق اور رفع اختلاف ہے، جیسا کہ صاحبان زہد و تقویٰ ائمہ مثلاً امام ابو محمد جوینی اور ان جیسے علما کا اسی پر عمل رہا ہے- امام ابو محمد جوینی نے المحیط لکھی اور اس میں کسی خاص مسلک فقہ کی پیروی کا التزام نہیں کیا- (ص:۲۱)

ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ شیخ امام، عظیم فقیہ، محدث، مفسر، اصولی شیخ عبدالعزیز دیرینی، شیخ الاسلام عزالدین بن جماعہ مقدسی، علامہ شہاب الدین برلسی المعروف بہ ابن اقبیطع رحمہم اللہ تعالیٰ اور شیخ علی بنتیتی مذاہب اربعہ پر فتویٰ دیتے تھے- شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے ایسے علما کی ایک بڑی جماعت کا ذکر کیا ہے جو لوگوں کو مذاہب اربعہ پر فتویٰ دیا کرتے تھے، خصوصا عوام کے حق میں جو نہ کسی مسلک فقہ سے بندھے ہوتے ہیں، نہ اس کے قواعد و نصوص سے آشنا ہوتے ہیں- وہ علما فرماتے کہ عوام کا عمل کسی بھی عالم کے قول کے مطابق ہو جائے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ہے-

اگر کوئی یہ کہے کہ ان علما کے لیے یہ کیوں کر صحیح ہوا کہ انھوں نے لوگوں کو ہر مسلک فقہ کے مطابق فتوی دیا جب کہ وہ مقلد تھے اور مقلد کی شان یہ ہے کہ اپنے امام کے قول سے باہر نہ نکلے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ وہ اجتہاد مطلق منتسب کے مقام پر فائز ہوں، جو اپنے امام کے اصول سے باہر نہیں جاتا، جیسے امام ابو یوسف، محمد بن حسن، ابن القاسم، اشہب، مزنی، ابن المنذر اور ابن سریج- ان تمام علما نے اگر چہ لوگوں کو ایسے فتوے دیے جن کی صراحت ان کے امام نے نہیں کی تھی، لیکن اس کے باوجود یہ اپنے امام کے اصول سے نہیں نکلے- امام جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ اجتہاد مطلق کی دو قسمیں ہیں:

> مطلق غیر منتسب، جس پر ائمہ اربعہ فائز ہیں اور مطلق منتسب، جس پر ان کے اکثر اصحاب فائز ہیں، جن کا ہم نے ذکر کیا-
>
> یہ بھی ممکن ہے کہ جو علما مذاہب اربعہ پر فتویٰ دیا کرتے تھے، اللہ نے انھیں شریعت کے اولین سرچشمے پر مطلع کر دیا ہو اور انھوں نے یہ مشاہدہ کیا ہو کہ ائمہ مجتہدین کے جملہ اقوال اسی سرچشمے سے متصل ہیں اور وہ بطور حکم عام کے فتوی نہ دیتے ہوں، بلکہ میزان کے دونوں مرتبوں کا لحاظ کرتے ہوئے لوگوں کے مناسب حال فتویٰ دیتے ہوں چنانچہ نہ وہ قوی کو رخصت کا حکم دیتے ہوں اور نہ ضعیف کو عزیمت کا حکم- (ص:۲۱/۲۲)

تمام اقوال ائمہ پر عمل ہونا چاہیے:

ہمارے بیان کردہ پیمانے پر جو عمل نہ کرے اور تمام مرجوح اقوال پر عمل کرنا ترک کر دے وہ لازمی طور پر، بہت سارے ثواب سے محروم ہوگا اور ان علما کے ساتھ سوئے ادب کا مرتکب ٹھہرے گا جن کے وہ اقوال ہیں، برخلاف اس کے جو اس پیمانے پر عمل کرے گا؛ کیوں کہ وہ قول مرجوح جسے یہ شخص ترک کر رہا ہے ممکن ہے دینی لحاظ سے زیادہ احتیاط پر مبنی ہو- ایسے میں اسے متروک کرنا مناسب نھیں، یا زیادہ احتیاط پر مبنی تو نہ ہو البتہ وہ رخصت ہو اور اللہ کو پسند ہے کہ اس کی رخصتوں پر بھی عمل کیا جائے، جب کہ اس کی شرائط ملحوظ رہیں، جیسا کہ اس بات کی صراحت حدیث پاک میں بھی موجود ہے-

میرے ایمانی بھائیوں کو یہ بھی معلوم رہے کہ ہر وہ عمل جس کی ایجاد مجتہدین نے فرمائی اس کے لیے جنت کا کوئی درجہ اور ہر وہ بدعت جسے مجتہدین نے حرام ٹھہرایا اس کے لیے جہنم کا کوئی گڈھا ہے، اگر چہ ان مجتہدین کا مقام و مرتبہ حضرت شارع علیہ السلام سے مختلف اور کم تر ہے اور ان کی پسند و ناپسند شارع علیہ السلام کی پسند و ناپسند سے کم درجہ رکھتی ہے، جیسا کہ اس کی صراحت اصحاب کشف نے فرمائی ہے- اس بات کو سمجھو اور تمہارے لیے مجتہدین نے جو کچھ فرمایا ہے ان پر عمل کرو اور ان تمام باتوں سے احتراز کرو جنھیں انھوں نے ناپسند فرمایا ہے اور مجتہدین سے اس سلسلے میں دلیل کا مطالبہ نہ کرو؛ کیوں کہ تم ان کے دائرے کے اندر محبوس ہو جب تک تم ان کے مقام کو نہ پہنچ جاؤ، تمہارے لیے ممکن نہیں کہ تم ان سے آگے بڑھ کر کتاب و سنت تک پہنچو اور جہاں سے انھوں نے احکام لیے ہیں وہاں سے تم بھی احکام لو-

میں نے حضرت علی الخواص رحمہ اللہ کو فرماتے سنا ہے کہ ائمہ کے ان تمام اقوال پر عمل کرو جو بظاہر ایک دوسرے کے مخالف ہیں بشرطے کہ ان پر عمل کے شرائط تم میں موجود ہوں، تا کہ تم پورا ثواب اٹھا سکو- وہ شخص جو پوری شریعت پر عمل کرتا ہے اس کے مقام سے اسے کیا نسبت

جو شریعت کی اکثر باتوں کو ترک کر دیتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا؛ کیوں کہ ایک مسلک فقہ کبھی بھی تمام دلائل کو محیط نہیں ہوسکتا، اگر چہ صاحب مذہب نے فی الجملہ یہ بات کہی ہے کہ صحیح حدیث ہی میرا مذہب ہے **اذا صح الحدیث فھو مذھبی** بلکہ بسا اوقات ایک امام کے مقلدین ان کثیر احادیث کو ترک کر دیتے ہیں جن کی صحت ان کے امام کے بعد ثابت ہوئی اور یہ بات ان کے امام کی مراد کے خلاف ہے- اس بات کو سمجھو- (ص:۲۵/۲۶)

کوئی حدیث یا اجتہاد قابل رد نہیں:

ہر مومن کو چاہیے کہ شرط عمل ملحوظ رکھتے ہوئے تمام احادیث اور مستنبط اقوال پر عمل کرے؛ کیوں کہ کوئی حدیث یا اجتہاد کبھی بھی میزان کے ان دونوں مراتب (تخفیف وتشدید) سے باہر نہیں ہوسکتا- میں نے سیدی علی الخواص رحمہ اللہ کو فرماتے سنا ہے کہ شارع کے کلام میں یا ائمہ کے کلام میں بظاہر جو کچھ تضاد تمہیں نظر آتا ہے وہ دراصل مختلف احوال پر محمول ہے؛ کیوں کہ شارع کا کلام اس سے بلند ہے کہ اس میں کوئی تضاد ہو- اسی طرح جو شخص جہالت وتعصب کے بجائے علم وانصاف کی نگاہ سے دیکھے گا اسے ائمہ کا کلام بھی تضاد سے پاک نظر آئے گا- (ص:۲۶)

جو کسی ایک امام کو مصیب سمجھے؟

اس سوال کے جواب میں کہ جو شریعت کے اولین سرچشمے سے محجوب ہوگیا، کیا اس پر تقلید شخصی واجب ہے؟ حضرت امام شعرانی رقم طراز ہیں:

جی ہاں! اس پر مسلک معین کی تقلید واجب ہے تاکہ نہ وہ خود گمراہ ہو اور نہ دوسروں کو گمراہ کرے- اس لیے اے برادر! جب تمہارا حجاب اٹھ جائے تو ان مقلدین کو معذور سمجھو جو ابھی محجوب ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہر مختلف فیہ مسئلے میں مصیب ایک ہی ہے اور شاید وہ میرا امام ہو- باقی خطا پر ہیں جو نفس الامر کے اعتبار سے درست ہونے کا احتمال رکھتے ہیں-

اے برادر! جو یہ کہتا ہے کہ ہر مجتہد مصیب ہے- اس کے قول کو اس پر محمول کرو کہ اس کا سلوک مکمل ہو چکا ہے، وہ تقلید سے باہر آچکا ہے اور وہ تمام علما کو عین شریعت سے سیراب ہونے کا مشاہدہ کر رہا ہے اور ہر وہ شخص جو یہ کہتا ہو کہ مصیب غیر متعین طور پر فقط ایک ہے اور باقی خطا پر ہیں، اگر چہ صواب کا احتمال رکھتے ہیں- اس کے قول کو اس طور پر لو کہ ابھی اس کا سلوک مکمل نہیں ہوا ہے- (ص:۲۹)

وسعت نہ کہ اختلاف:

امام شعرانی نے تشدید وتخفیف کا جو تاریخی اعتبار سے پہلا اور نادر اصول پیش کیا ہے، اس کے دلائل پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس میزان کے دلائل میں سے یہ دلیل بھی ہے کہ شارع کو ہم سے اختلاف کے بجائے اتفاق مطلوب ہے- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اللہ نے دین میں ان باتوں کو مشروع قرار دیا ہے جن کا حکم نوح کو دیا، جس کی وحی ہم نے تم پر نازل کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا، وہ یہ کہ دین قائم کرو اور اس میں اختلاف نہ کرو- (الشوریٰ:۱۳)

یعنی ایسی آرا پیش نہ کرو جو کتاب وسنت کے موافق نہ ہوں- رہے وہ اقوال جن کی تائید کتاب وسنت سے حاصل ہے وہ نفس دین سے ہیں تفرقہ نہیں-

اس میزان پر ایک دلیل اللہ کے یہ ارشادات بھی ہیں:

اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے تنگی نہیں چاہتا- (البقرۃ:۱۸۵) تمہارے اوپر دین کے معاملے میں اللہ نے تنگی نہیں رکھی ہے- (الحج:۶۵) اللہ سے ڈرو جہاں تک ہو سکے- (التغابن:۱۶) اللہ کسی جان کو اس کی برداشت سے زیادہ کا مکلّف نہیں کرتا- (البقرۃ:۲۸۶) اللہ لوگوں کے ساتھ بے حد مہربان اور کریم ہے- (الحج:۶۵)

رہیں اس باب میں احادیث تو وہ بہت سی ہیں- مثلاً: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: دین آسان ہے اور جو کوئی اس دین سے مقابلہ کرتا ہے وہ مغلوب ہوجاتا ہے- آپ نے سمع وطاعت پر بیعت لیتے ہوئے فرمایا تھا: آسانی اور مشکل میں ساتھ دینا جہاں تک تم سے ہو سکے اور آپ کا یہ فرمان کہ: جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو جہاں تک تم سے ہو سکے اسے بجالاؤ اور آپ کا یہ ارشاد بھی کہ میری امت کا اختلاف رحمت ہے-

یعنی شریعت کے فروعی احکام میں مختلف حالات میں ائمہ اور ان کے متبعین کے لیے وسعت ہے- اختلاف سے مراد یہاں عقیدہ توحید وغیرہ کے اصولی اختلاف نہیں ہیں- بعض علما نے یہ کہا ہے کہ یہاں اختلاف سے مراد امور معاش کا اختلاف ہے- اس کا بیان آئندہ آئے گا کہ اسلاف لفظ اختلاف کے استعمال کو ناپسند فرماتے تھے، اسے وہ وسعت کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے تاکہ کہیں عوام غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں- حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک فرمایا کرتے تھے: یہ نہ کہو کہ علما نے اس مسئلے میں اختلاف کیا ہے بلکہ یہ کہو کہ علما نے امت کے لیے اس مسئلے میں وسعت پیدا کی ہے- (ص:۳۳)

تبدیلی مسلک جائز ہے:

امام شعرانی نے لکھا ہے کہ تبدیلی مسلک کی روایت ماضی میں ہمیشہ قائم رہی ہے اور اس کے باوجود علما نے اس پر کسی طرح کی ناگواری کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ اسے تسلیم کیا ہے- امام شعرانی اس امر کو اپنے میزان تخفیف وتشدید کی تائید میں پیش کرتے ہیں، کیونکہ علما کے مذکورہ رویے سے یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ تمام مذاہب کو برحق اور تمام اقوال کو صحیح تسلیم کرتے تھے-

امام شعرانی نے تبدیلی مسلک کے جواز پر بحث کرتے ہوئے امام زناتی مالکی کے حوالے سے تبدیلی مذہب کی درج ذیل تین شرائط لکھی ہیں:

۱- دو مسالک کے بیچ ایسی راہ نہ نکالے کہ اجماع کی خلاف ورزی لازم آئے، مثلا: کوئی شخص بغیر مہر، بغیر ولی اور بغیر گواہ کے نکاح کرے؛ کیوں کہ یہ صورت کسی امام کے نزدیک درست نہیں-

۲- جس کی تقلید کرے اس کی فضیلت کا اعتقاد رکھے-

۳- اندھی تقلید نہ کرے، مثلاً: اپنے امام کی تقلید کر کے رخصت پر عمل کرے جب کہ اس کے اندر رخصت پر عمل کرنے کی شرائط ہی نہ ہوں-

اس کے بعد امام جلال الدین سیوطی کے حوالے سے تبدیلی مسلک کرنے والے علما کی فہرست پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شیخ عبدالعزیز بن عمران الخزاعی جو فقہ مالکی کے اکابر علما میں تھے، جب امام شافعی بغداد تشریف لائے تو ان کا اتباع کرنے لگے، ان کی درس گاہ میں پڑھا اور ان کے علم کی اشاعت کی- محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم بھی امام مالک کے مسلک پر تھے، جب امام شافعی مصر تشریف لائے تو ان کے مسلک سے وابستہ ہو گئے اور دوسروں کو بھی امام شافعی کے اتباع پر ابھارنے لگے- کہتے، بھائیو! یہ مسلک نہیں ہے مکمل شریعت ہے، جب کہ امام شافعی فرماتے کہ تم عنقریب اپنے باپ کے مسلک کی طرف لوٹ جاؤ گے- چنانچہ جب امام شافعی کی وفات ہوگئی تو وہ حضرت امام کے فرمان کے مطابق ان کے مسلک سے پھر گئے- دراصل ان کا خیال یہ تھا کہ امام شافعی اپنے بعد انہیں اپنے حلقہ درس کا جانشیں بنائیں گے لیکن انھوں نے امام بویطی کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تو ابن عبدالحکم مسلک امام شافعی سے پھر گئے اور اس طرح امام شافعی کی فراست مومنانہ صادق آگئی- (ص:۴۹/۵۰)

اس ضمن میں جن دوسرے علما کا ذکر کیا ہے ان میں ابراہیم بن خالد بغدادی، ابوثور، ابوجعفر بن نصر ترمذی، ابوجعفر طحاوی، خطیب بغدادی، ابن فارس، سیف آمدی صولی، شیخ نجم الدین بن خلف مقدسی، شیخ محمد بن دہان نحوی، شیخ تقی الدین بن دقیق العید، شیخ الاسلام کمال الدین بن یوسف دمشقی اور امام ابوحیان کے نام شامل ہیں-

حضرت امام شعرانی نے علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ کے حوالے سے تبدیلی مسلک کی چھ صورتیں لکھی ہیں- ان میں بعض جائز ہیں، بعض مذموم، بعض حرام اور بعض ایسی بھی ہیں جو واجب ہیں- یہ چھ صورتیں یہ ہیں:

۱- تبدیلی کا محرک دنیوی راحت وآسائش ہو، یہ مذموم ہے-

۲- تبدیلی کا محرک دنیوی راحت وآسائش ہی ہو، لیکن تبدیلی کرنے والا ایک عام آدمی ہو جو فقہ سے آشنا نہیں ہوتا، برائے نام مقلد ہوتا ہے، جیسے عوام الناس، ارکان حکومت، سلطنت کے ملازمین اور مدارس کے خدام- ان کا حکم خفیف ہے- اس لیے ان کے اس عمل پر حرمت کا فتوی نہیں دیا جائے گا-

۳- تبدیلی کا محرک اسی طرح دنیوی آسائش ہو- لیکن متعلق شخص کسی مسلک فقہ کا فقیہ عالم ہو- وہ صرف دنیوی اغراض ومناصب کے لیے تبدیلی مسلک کر رہا ہو- یہ عمل حرام ہے، کیوں کہ اس میں دنیوی غرض کے لیے شریعت سے کھلواڑ کرنا لازم آ رہا ہے، نیز اس سے یہ بھی لازم آ رہا ہے کہ مذکورہ شخص امام سابق کے محاسن کا قائل نہیں ہے-

۴- تبدیلی کا محرک دینی غرض ہو- متعلق شخص فقیہ مسلک ہو-

لیکن اس پر دوسرے کی ترجیح واضح ہوگئی ہو- یہ تبدیلی جائز ہے، بلکہ واجب ہے-

۵- تبدیلی کا محرک دینی غرض ہو، لیکن متعلق شخص فقہ سے عاری ہو، اس نے کسی ایک مسلک کے اعتبار سے تحصیل فقہ کی کوشش کی ہو لیکن کامیاب نہ ہوا ہو اور اسے ایسا لگتا ہو کہ دوسرے مسلک کے اعتبار سے بہ آسانی تحصیل فقہ کرسکتا ہے اور اس لیے اسے تبدیلی مسلک کرنی ہو- ایسے شخص کے لیے قطعی طور پر تبدیلی مسلک کرنا واجب ہے تاکہ کسی بھی ایک امام کے سایے میں آکر عالم ہوجائے اور جہالت کی تاریکی سے بچ جائے- امام طحاوی کے ساتھ یہی ہوا- وہ اپنے ماموں امام مزنی کی درس گاہ میں تھے- ایک دن کوئی بات سمجھ نہیں پا رہے تھے- شیخ نے جھنجھلا کر حلفیہ یہ کہہ دیا کہ تم کچھ نہیں سیکھ پاؤگے- اس کے بعد امام طحاوی حنفی فقہ سیکھنے لگے اور امام وقت بنے- آپ فرماتے تھے کہ اگر ہمارے ماموں زندہ ہوتے تو انھیں اپنی قسم کا کفارہ دینا پڑتا-

۶- تبدیلی کا محرک کچھ بھی نہ ہو، نہ کوئی غرض دنیا اور نہ کوئی فکر دین ایسا کرنا ایک عامی کے لیے جائز ہے اور فقیہ کے لیے مکروہ یا ناجائز-

(ملخصاً، ص:۵۲-۵۳)

تبدیلی مسلک کے حوالے سے اس عہد میں ایک غلط فہمی یہ رائج تھی کہ دوسرے مسلک کو ترک کر کے کوئی حنفی تو بن سکتا ہے لیکن کوئی حنفی دوسرا مسلک اختیار نہیں کرسکتا- یہ سوال جب امام سیوطی کے پاس پیش ہوا تو آپ نے فرمایا:

> قائل کا یہ تحکمانہ فرمان ہے- کتاب وسنت سے اس پر کوئی دلیل نہیں ہے- کسی حدیث صحیح یا ضعیف میں تعیین کے ساتھ کسی امام کی فضیلت وارد نہیں ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے تقدم زمانی سے ان کی افضلیت پر اگر کوئی استدلال کرے اور اس استدلال کو درست مانا جائے تو لازم آئے گا کہ جو بھی اجتہاد کی اہلیت نہیں رکھتا وہ امام ابوحنیفہ کی تقلید کرے اور یہ خلاف اجماع ہے- (ص:۵۱)

اذا صح الحدیث فھو مذہبی کا مفہوم:

اجتہاد وتقلید کے باب میں ائمہ مجتہدین کے اس قسم کے ارشادات: **اذا صح الحدیث فھو مذھبی** جب حدیث کی صحت ثابت ہوجائے تو وہی میرا مذہب ہے- اہل علم کے درمیان کافی زیر بحث رہے ہیں- بعض علما نے اس کے معنی یہ لکھے ہیں کہ جن علما کا یہ ارشاد ہے ان کے اقوال احادیث صحیحہ پر ہی مبنی ہیں- ان کا کوئی قول حدیث صحیح کے خلاف نہیں ہے- بعض نے اس کا مطلب یہ بتایا کہ قائل کی مراد یہ ہے کہ جب بھی کوئی صحیح حدیث مل جائے میں اپنے قول سے اس صحیح حدیث کی طرف رجوع کرلیتا ہوں- بعض علما نے اس ارشاد کے یہ معنی لیے ہیں کہ ائمہ نے یہ بات اپنے متبعین کے حق میں کہی ہے کہ اگر میرے بعد کوئی حدیث صحیح مل جائے تو اس پر عمل کرنا، میرے قول کو ترک کردینا؛ کیوں کہ حدیث صحیح کے بالمقابل میرے قول کی کوئی حیثیت نہیں-

پھر اسی قول سے متعلق ایک دوسرا مسئلہ اہل علم کے یہاں موضوع بحث رہا ہے کہ ائمہ مجتہدین تک تمام حدیثیں پہنچ گئی تھیں یا نہیں؟ اس بحث کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جو احادیث ہم تک پہنچی ہیں یہ من جملہ تمام احادیث ہیں یا ان میں سے بعض مفقود بھی ہوگئی ہیں- اسی سلسلہ بحث کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ بعض احادیث ائمہ مجتہدین تک صحت کے ساتھ پہنچی تھیں اور وہ بعد میں آکر ضعیف ہوگئیں- بہرکیف! ائمہ مجتہدین کا یہ ارشاد: **اذاصح الحدیث فھو مذھبی** کی تفہیم میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کی اجتہاد وتقلید کے حوالے سے بڑی اہمیت ہے- امام شعرانی نے بھی اس پر کلام فرمایا ہے- ان کے چند اقتباسات یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

> میں نے سیدی علی الخواص رحمہ اللہ کو فرماتے سنا کہ جو شخص ایک مسلک کا مقلد ہو وہ کبھی بھی پوری شریعت پر عمل نہیں کرسکتا- اگرچہ اس کے امام نے یہ بات کہی ہے کہ: اذا صح الحدیث فھو مذہبی حدیث صحیح ہی میرا مسلک ہے اس کے باوجود وہ مقلد ان بہت ساری احادیث کو ترک کردیتا ہے جن کی صحت دوسرے ائمہ کے نزدیک ثابت رہی ہے- اس میزان کے تناظر میں یہ رویہ اس مقلد کی بے بصیرتی ہے اور اپنے امام کے فرمان کو غلط طور پر سمجھنا ہے- گویا اس کے امام نے اپنی طرف سے شریعت گڑھ دی ہو- اس کے امام جو یہ فرماتے ہیں: **اذاصح الحدیث ای بعدی فھو مذھبی** یعنی جب میرے بعد صحیح حدیث ملے تو وہی میرا مسلک ہے وہ دوسرے کے بالمقابل پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام کے ارشادات کی

اہمیت کو زیادہ سمجھنے والے ہیں- واللہ اعلم

یہ بڑا نفیس کلام ہے، کیوں کہ احکام شریعت کی تکمیل اسی وقت ہوگی جب احادیث و مسالک کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر اس طرح کر دیا جائے جیسے کہ دو مرتبے (تشدید وتخفیف) کا حامل ایک مسلک بن جائے- (ص:۳۵)

اس کے بعد خود ہی یہ سوال قائم کرتے ہیں کہ اگر تم کہو کہ وہ حدیث جن کی صحت میرے امام کی وفات کے بعد ثابت ہوئی، میرے امام نے ان سے استفادہ نہیں کیا، ان کا کیا کروں؟ اور پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں:

> بہتر یہی ہے کہ ان احادیث پر عمل کرو؛ کیوں کہ اگر تمہارے امام کو وہ حدیثیں مل جاتیں اور ان کی صحت ان پر واضح ہو جاتی تو عین ممکن ہے کہ وہ تمہیں اس کا حکم دیتے؛ کیوں کہ تمام ائمہ شریعت کے اسیر ہیں...... جو ایسا عمل کرتا ہے وہ دونوں ہاتھوں سے خیر لوٹتا ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ میں صرف اسی حدیث پر عمل کروں گا جس کو میرے امام نے لیا ہے وہ بھی خیر کثیر کا حامل ہے- جیسا کہ اسی موقف پر کثیر مقلدین قائم ہیں- جب کہ ان کے لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ ہر اس حدیث پر عمل کریں جس کی صحت ان کے امام کے بعد ثابت ہوئی تا کہ ائمہ کی وصیتوں کا نفاذ ہو سکے؛ کیوں کہ ہمارا اعتقاد یہی ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے اور انہیں وہ حدیثیں مل جاتیں جن کی صحت ان کے بعد ثابت ہوئی تو وہ ضرور ان سے استفادہ کرتے، ان پر عمل کرتے اور ان کے بالمقابل اپنے قیاس کو ترک فرما دیتے- (ص:۳۶)

اذا اخطا المجتهد کے معنی:

امام شعرانی پورے شد و مد سے اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ تمام ائمہ برحق اور مصیب ہیں، ان میں کوئی خاطی نہیں، جب کہ حدیث میں واضح طور پر یہ بات آئی ہے کہ مجتہد سے خطا ہوتی ہے، ارشاد ہے: **اذا اجتهد الحاكم واخطا فله اجر وان اصاب فله اجران** -اگر حاکم اجتہاد کرے اور خطا کر جائے تو اسے ایک اجر ملے گا اور اگر وہ صواب پر پہنچ جائے تو دو اجر- اس حدیث سے امام شعرانی کے نظریے پر جو اعتراض ہوتا ہے، اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

> یہاں خطا سے مراد مجتہد کا اس مسئلہ میں دلیل نہ پانا ہے- یہ مطلب نہیں کہ وہ اس کی وجہ سے شریعت سے باہر چلا جائے گا، کیوں کہ مجتہد اگر شریعت سے خارج ہو تو اسے کوئی اجر نہیں ملتا- اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **كل امر ليس عليه امرنا فهو رد** ہر وہ بات جو میرے دین سے باہر کی ہو وہ مردود ہے- چوں کہ شارع نے خطا کے بعد بھی مجتہد کے لیے اجر ثابت رکھا ہے، اس لیے لامحالہ حدیث کے معنی یہی ہوں گے کہ جب مجتہد اجتہاد کرے اور شارع سے منقول اس بات کی دلیل کو پالے تو اس کے لیے دو اجر ہیں- ایک تلاش کرنے کا اجر اور دوسرا پا لینے کا اور اگر وہ دلیل نہ پا سکے صرف حکم پائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے اور وہ تلاش کرنے کا اجر ہے- اس لیے مذکورہ حدیث میں خطا سے مراد اضافی خطا ہے، خطائے مطلق نہیں- (ص:۲۶)

جاری ہے

❑❑❑

☆استاذ: جامعہ عارفیہ، خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد (یوپی)
email: zishanmisbahi@gmail.com

حالات حاضرہ

مولانا محمد احمد مصباحی☆

فرزندان اشرفیہ آج بھی اہل باطل کے خلاف سینہ سپر ہیں

کرم فرماؤں کی پیہم یورشیں بھی ان شاء اللہ ارکانِ اشرفیہ اور ابناے اشرفیہ کو بد مذہبوں اور بے دینوں کی دسیسہ کاریوں سے اہل سنت کو بچانے اور اشاعت مسلک حق کی راہ میں اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ سرگرم سفر رہنے سے غافل نہیں کرسکتیں۔

دارالعلوم قادریہ پونہ (مہاراشٹر) کے زیر اہتمام بے ورلی ہلس ہوٹل، پونہ میں ۱۵/۱۶/۱۷ صفر ۱۴۳۵ھ/ ۱۹/۲۰/۲۱ دسمبر ۲۰۱۳ء کو مجلس شرعی، جامعہ اشرفیہ مبارک پور کا اکیسواں فقہی سیمینار منعقد ہوا، جس میں مندرجہ ذیل خطبہ صدارت پڑھا گیا۔

بِسمِ اللہ الرحمنِ الرحِیمِ

نحمدہ و نصلِی علی رسولِہِ الکرِیمِ

حضرات! یہ دارالعلوم قادریہ پونہ کے زیر اہتمام مجلس شرعی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کا اکیسواں فقہی سیمینار ہے جو مہاراشٹر کے مشہور شہر پونہ کی سرزمین پر منعقد ہو رہا ہے۔ میں اس سیمینار میں آپ حضرات کی تشریف آوری پر خیر مقدم کرتا ہوں اور آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے قدوم میمون سے ہمیں ممنون فرمایا۔ یہی نہیں بلکہ چند ماہ قبل جب مجلس شرعی کے سوالات آپ کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے اپنی دیگر علمی، دینی اور ذاتی وخانگی مصروفیات سے اِن سوالات کے جوابات تیار کرنے کے لیے اپنا قیمتی اور اہم وقت صرف کیا اور حل تک رسائی کے لیے حسبِ وسعت سعیِ بلیغ فرمائی اور اب ابحاث و مذاکرات میں بھی حصہ لے کر مسائل کو روشن و منقح اور فیصل کرنے کے لیے اپنی فکری و علمی توانائیاں صرف کریں گے۔ یہ ساری مساعی جمیلہ ہمارے لیے مزید تشکر و امتنان اور قلبی مسرت و اطمینان کا ہمت افزا سامان ہیں۔ رب کریم سب کو اپنی جزاے فراواں اور نعمتہاے بے پایاں سے نوازے۔ آمین یا اکرم الاکرمین۔

دوسری طرف ہم دار العلوم قادریہ کے صدر مولانا نوشاد عالم مصباحی غازی پوری مقیم افریقہ، ناظم اعلی مولانا ایاز احمد مصباحی اور دیگر ارکان و معاونین اور محبین و مخلصین کے بھی شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اکیسویں فقہی سیمینار کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ اِس راہ میں جامعہ اشرفیہ کو اپنے بیش بہا تعاون سے نوازا اور اِس علمی و فقہی کارواں کی راحت و ضیافت کے لیے اپنی قربانیاں پیش کیں۔ یقیناً یہ حضرات اپنی سعادت اور علم و علما سے والہانہ محبت کے باعث آپ کی دعاؤں کے مستحق ہیں۔ رب جلیل انھیں دارین کی فیروزمندیوں سے سرفراز بنائے۔

حضرات! مجلس شرعی کے مذاکرات کی یہ دیرینہ روایت ہے کہ اس میں ہر صاحب علم کو سنجیدگی اور متانت کے ساتھ کھل کر بحث کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ ایک مندوب نے کوئی راے پیش کی اور دوسرے کو اس سے اختلاف ہے تو وہ برملا اس کا اظہار کرتا ہے۔ ایک نے کوئی دلیل یا کوئی عبارت اپنے موقف کے ثبوت میں پیش کی اور دوسرے کی نظر میں اس کے خلاف کوئی دلیل یا کوئی عبارت ہے تو وہ اسے سامنے لاتا ہے، کسی نے کوئی نظریہ پیش کیا جس کی دلیل لوگوں کی نظر میں نہیں تو اس سے دلیل کا مطالبہ ہوتا ہے۔

میں کئی سال پہلے اپنے ایک مضمون میں لکھ چکا ہوں کہ اسبابِ ستہ سے متعلق مذاکرات میں ایک بار فقہاے کرام کے ارشاد **الحاجۃ قد تتنزل منزل الضرورۃ** پر یہ سوال ہوا کہ وہ کون سے مواقع ہیں جہاں حاجت بمنزل ضرورت قرار پاتی ہے؟ بہت سے لوگوں نے جواب دینے کی کوشش کی مگر ہر جواب پر اعتراض وارد ہوتا رہا۔ کافی دیر کے بعد نائب مفتی اعظم ہند حضرت شارح بخاری مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ نے اپنے جنچے تلے جامع و مانع الفاظ میں اس کی وضاحت فرمائی۔ اس پر کوئی اعتراض تو نہ ہو سکا، مگر خاص طور سے نوجوان مندوبین کی جانب سے بیک زبان اس کا مطالبہ ہونے لگا کہ حضرت! اس پر کوئی حوالہ پیش فرمائیں۔ یہ نوجوان علما حضرت شارح بخاری کے تلامذہ کے تلامذہ کی صف میں آتے تھے اور ان کے علمی پوتوں کی حیثیت رکھتے تھے مگر وہ حضرت سے مرعوب ہو کر خاموش نہ رہے اور نہ حضرت نے اپنی لمبی عمر اور طویل فقہی تجربات کا حوالہ دے کر انھیں خاموش کرنے کی کوشش کی بلکہ فرمایا کہ مجھے خوشی ہے کہ مجھ سن رسیدہ سے آپ

لوگ مرعوب نہ ہوئے اور مجھ سے بھی حوالے کا مطالبہ کر دیا- اس سے مجھے امید ہے کہ ہمارے بعد بھی آپ یہ علمی وفقہی کام پوری تحقیق و تنقیح کے ساتھ انجام دیتے رہیں گے اور کسی سے مرعوب ہوکر کوئی بے دلیل بات قبول نہ کریں گے- جو حضرات مجلس شرعی کے سیمیناروں میں شریک ہوتے ہیں انھیں بخوبی معلوم ہے کہ آج بھی وہ روش برقرار ہے- سوالات اوراعتراضات کو سنجیدگی سے سنا جاتا ہے اور شافی حل نکالنے پر پوری کوشش صرف ہوتی ہے- رب جواد ومنان ووہاب اس علمی وتحقیقی روش کو ہمیشہ قائم رکھے اور ہر قسم کی نظر بد سے بچائے-

ہمارے سیمیناروں میں شرکت کرنے والے حضرات کو معلوم ہے کہ جب کسی عنوان پر مقالات کی تلخیص پیش ہوتی ہے تو رایوں میں بڑا اختلاف نظر آتا ہے- بعض اوقات دو مختلف رایوں میں سے ہر رائے پر دلیل کی قوت بھی نظر آتی ہے، تلخیص میں ہر رائے کو اس کی دلیل کے ساتھ پوری دیانت داری سے ظاہر کر دیا جاتا ہے- پھر جب سنجیدگی و متانت، اخلاص وحسن نیت اور دلائل وشواہد کی قوت کے ساتھ بحث ہوتی ہے تو رب کریم کا فضل عظیم شامل حال ہوتا ہے اور اکثر یہی ہوتا ہے کہ کسی قوی اور راجح دلیل کے باعث تمام مندوبین کا ایک رائے پر اتفاق ہوجاتا ہے اور اسی کے مطابق فیصلہ درج کرلیا جاتا ہے-

بالفرض کسی کو کوئی اختلاف ہوا اور جوابات سے اس کی تشفی نہ ہو سکی تو اسے تصدیقی دستخط ثبت کرنے سے آزاد رکھا جاتا ہے- کسی سے اس بات کی گزارش نہیں ہوتی کہ ہماری رعایت میں اپنے موقف کے خلاف دستخط کر دیجیے-

ایک دو نظیریں ایسی بھی ہیں کہ کسی رائے پر سب کا اتفاق نہ ہوسکا تو اختلاف کی نشاندہی کے ساتھ فیصلہ درج کیا گیا- یہ بھی کسی جزئی فرعی رائے میں ہوا ورنہ اکثر مسائل بنیادی نقطہ نظر کے اعتبار سے شافی حل سے ہمکنار ہوئے- ان شاء المولی تعالی ان فیصلوں کا مجموعہ جلد ہی اشاعت پذیر ہوگا جسے ملاحظہ فرمانے کے بعد اہل علم اِن شرکاے مذاکرات کی تحقیقی کاوشوں کا مکمل نہیں تو کچھ اندازہ ضرور کرسکیں گے- رہے عوام تو وہ بھی اپنی ضرورتوں کا حل دریافت کر کے یقیناً مسرور ہوں گے-

گذشتہ سال بیسواں فقہی سیمینار جامعہ البرکات علی گڑھ کی سرزمین پر سرکار مارہرہ مطہرہ کے سجادہ نشین امین ملت حضرت سید شاہ محمد امین برکاتی دام ظلہ کی سرپرستی اور ان کے اعزہ کے اہتمام وانتظام میں منعقد ہوا، اس کے موضوعات یہ تھے:

(۱) انٹرنیٹ کے مواد ومشمولات کا شرعی حکم
(۲) عذر کے باعث طوافِ زیارت میں ایک یوم کی تاخیر
(۳) جینٹک ٹیسٹ کا شرعی حکم
(۴) دورحاضر میں چلتی ٹرین پر نماز کا حکم

ان موضوعات پر کھل کر بحثیں ہوئیں اور مسائل اپنے دلائل کے ساتھ حل کی منزل سے ہمکنار ہوئے جس سے علی گڑھ اور دیگر مقامات کی علمی فضا پر اچھا اثر قائم ہوا- فالحمد للہ علی ذلک-

مگر کچھ اپنے ہی کرم فرماؤں نے اپنے خاص سنی حنفی بھائیوں کے بعض حساس حلقوں میں اس کا سخت منفی اثر پیدا کرنے کی کوشش کی اور صرف چلتی ٹرین کا مسئلہ ذکر کیا، گویا بیسویں فقہی سیمینار میں نہ کوئی دوسرا موضوع زیر بحث آیا، نہ اس پر کوئی فیصلہ ہوا- اسی پر بس نہیں دیگر سیمیناروں میں جو فیصلے ہوئے انھیں بھی مبہم طور پر بے وقعت اور ناقابل التفات جتانے کی سعیِ ناروا، روا رکھی گئی- اِس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو الجامعۃ الاشرفیہ کے پورے وجود کو نشانہ بنایا گیا اور ممبئی و پوربندر کی سرزمین سے اس پر علانیہ حملوں کا مجاہدانہ وبہادرانہ کارنامہ انجام دیا گیا، جس پر اہل سنت کو حیرت کے ساتھ افسوس بھی ہے کہ وہ ادارہ جو ماضی کی طرح حال میں بھی دین ومسلک کی نمایاں اور ممتاز خدمات انجام دینے میں منہمک ہے، جس کے فرزند آج بھی اہل باطل کے خلاف ملک و بیرونِ ملک ہر جگہ سینہ سپر ہیں، اسے یوں نشانہ بنانا کسی طرح درست نہیں- ہاں! اس محاذ آرائی میں غیروں کے لیے مسرت وخوشی کا سامان ضرور ہے-

چلتی ٹرین میں نماز کا مسئلہ مجلس شرعی سے نشر شدہ دو کتابوں میں پوری علمی وتحقیقی متانت کے ساتھ بغیر کسی گالی گلوچ کے واضح کیا جاچکا ہے- (۱) فقہ حنفی میں حالات زمانہ کی رعایت: فتاوی رضویہ کے حوالے سے (۲) چلتی ٹرین میں نماز کا حکم

اہل علم اِن دونوں کا مطالعہ کریں، ان شاءاللہ پوری تشفی ہوجائے گی-

اس کے بعد یہاں اسے بیان کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی مگر توضیح مزید کے لیے میں بھی اپنے الفاظ میں کچھ عرض کرنے کی کوشش کر رہا ہوں- خدا نے چاہا تو رائیگاں نہ ہوگی-

ہم اس بات کے قائل ہیں کہ نماز یا وضو وغسل سے رکاوٹ کی دو

قسمیں ہیں- ایک وہ جو رب کی طرف سے ہو، دوسری وہ جو بندوں کی طرف سے ہو- اول میں جس طرح ہو سکے نماز ادا کر لے اور بعد میں اعادہ نہیں- دوم میں جیسے ہو سکے ادا کر لے، پھر جب رکاوٹ جاتی رہے تمام شرطوں کے ساتھ اعادہ کرے- یہ حکم فرض و واجب یا ملحق بواجب نمازوں کے لیے ہے-

کتب فقہ میں بندوں کی جانب سے رکاوٹ کے تحت یہ مثالیں دی گئی ہیں (۱) کسی شخص کو کسی دشمن نے قید کر لیا اور وضو یا نماز کی مہلت نہیں دیتا (۲) پانی پر دشمن ہے اور دھمکی دے چکا ہے کہ تم ادھر آئے تو قتل کر دوں گا یا ہاتھ پاں توڑ ڈالوں گا (۳-۴) یا پانی سے وضو و غسل کرنے پر یا باوضو کو نماز پڑھنے پر اس طرح کی دھمکی دے رہا ہے اور نمازی کو غالب گمان ہے کہ دشمن جو کہہ رہا ہے اسے کر گزرے گا تو ان حالتوں میں اسے حکم ہے کہ جیسے ہو سکے نماز ادا کر لے پھر بعد زوالِ مانع اعادہ کرے-

اس مضمون کے فقہی جزئیات میں یہ امر بالکل واضح ہے کہ کوئی شخص نمازی کو براہ راست نماز یا وضو و غسل سے روکنے والا ہے- آج بھی کوئی شخص اس طرح کسی نمازی کو براہ راست نماز یا وضو و غسل سے روکے تو اس کے "منع من جهة العبد" ہونے میں کوئی کلام نہیں، اور حکم وہی ہوگا کہ فی الحال جیسے ہو سکے ادا کر لے اور زوال مانع کے بعد اِعادہ کرے-

اب ریلوے نظام پر غور کریں تو مختلف صورتیں سامنے آئیں گی:

(۱) ابتدا میں یہ حال تھا کہ ٹرینوں میں پانی کا انتظام نہ ہوتا- بعد میں کچھ ٹرینوں میں انتظام رہنے لگا- اب تقریباً سبھی ٹرینوں میں پانی موجود ہوتا ہے- اس لیے وضو و غسل سے رکاوٹ جاتی رہی-

(۲) اعلیٰ حضرت اور محدث سورتی علیہما الرحمہ کے زمانے میں بالعموم ٹرینوں کے اسٹاپ قریب قریب اور ٹھہرنے کے وقفے زیادہ تھے اس لیے محدث سورتی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ مجھے سو بار سے زیادہ ٹرین سے سفر کا اتفاق ہوا، ایک اسٹیشن پر اتر کر وضو کر لیا، دوسرے اسٹیشن پر اتر کر نماز پڑھ لی، کبھی چلتی ٹرین پر نماز پڑھنے کی نوبت نہ آئی- اس سے معلوم ہوا کہ اس زمانے کا حال یہ تھا کہ ذرا اہتمام کر لیا جائے تو ٹرین سے اتر کر باضابطہ زمین پر نماز کی ادائیگی میسر تھی-

(۳) اب یہ حال ہے کہ بہت سی ٹرینیں بعض نمازوں مثلاً عصر یا مغرب یا فجر کے پورے وقت میں ایک بار بھی نہیں رکتیں اور کبھی رکتی ہیں تو اس قدر کم کہ اتنے وقفے میں نماز کی ادائیگی نہیں ہو پاتی اور اب چند سالوں سے کچھ ایسی ٹرینیں بھی چلی ہیں جو ظہر و عشا کے اوقات میں بھی نہیں رکتیں-

(۴) پہلے ریلوے نظام، حکومت نے پرائیویٹ کمپنیوں کے ہاتھ میں دے رکھا تھا- انھوں نے ٹرینوں کے ٹھہرنے کے اوقات میں انگریزوں کے کھانے کی رعایت رکھی تھی- بعد میں یہ نظام جب حکومت نے خود اپنے ہاتھوں میں لیا تب بھی وقف طعام کی رعایت برقرار رہی- اب بیس سال یا زیادہ عرصے سے یہ حال ہے کہ ٹرینوں کے ٹھہرنے میں کھانے کے اوقات کی خاص رعایت بالکل نہ رہی- رکتی ہیں تو سب کے لیے، نہیں رکتی ہیں تو کسی کے لیے نہیں-

غور طلب امر یہ ہے کہ محکمہ ریلوے براہ راست ادائے نماز سے مانع کبھی نہ رہا، پھر اسے نماز سے مانع کیوں قرار دیا گیا؟ وجہ یہ ہے کہ نماز کے لیے ایک شرط 'استقرار علی الارض' ہے جو ٹرین رواں رہنے کی صورت میں پوری نہیں ہوتی- اگر محکمہ ریلوے اوقاتِ طعام کی طرح اوقاتِ نماز میں ٹرین روکنے کا انتظام کرتا تو یہ شرط ضرور پوری ہو جاتی- مگر اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے زمانے میں اس نے انگریزوں کے کھانے کے لیے ٹرین روکنے کی رعایت رکھی، مسلمانوں کی نماز کے لیے یہ رعایت نہ رکھی، اس لیے امام اہل سنت قدس سرہ نے اسے مانع اور اس منع کو 'منع من جہۃ العباد' قرار دیا اور اپنی عبارت کے مفہوم سے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ اگر ٹرین انگریزوں کے طعام اور مسلمانوں کی نماز کسی کے لیے نہ روکی جاتی اور صرف چلنا ہی چلنا اور منزل تک پہنچنا، پہنچانا ہی مقصود ہوتا تو اسے بالواسطہ مانع اور اس رکاوٹ کو منع من جہۃ العباد قرار نہ دیا جاتا- اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے الفاظ ملاحظہ کریں:

> انگریزوں کے کھانے وغیرہ کے لیے روکی جاتی ہے اور نماز کے لیے نہیں تو منع من جہۃ العباد ہوا، اور ایسے منع کی حالت میں حکم وہی ہے کہ نماز پڑھ لے اور بعد زوالِ مانع اعادہ کرے-

(فتاوی رضویہ ج۳، ص:۴۴، سنی دارالاشاعت، مبارک پور)

منع من جہۃ العباد ہونے کی تفریع دو امروں پر ہے، انگریزوں کے کھانے کے لیے روکنا، اور نماز کے لیے نہ روکنا، جس سے صاف ظاہر

ہے کہ اگر دونوں کے لیے نہ روکنا ہوتو منع من جہ العباد نہیں- صرف ایک امر کو لینا اور دوسرے کو ساقط کر دینا کسی طرح قرین انصاف نہیں-

اس سے زیادہ واضح اور متفق علیہ مسئلہ شتر بانوں کے قافلے کا ہے- وہ اونٹوں کو ایک بار دوپہر میں روکتے، دوسری بار رات کو نصف شب کے قریب روکتے - حنفیوں کو عصر و مغرب سواری سے اتر کر پڑھنے کا موقع نہ ملتا- انھیں حکم ہوا کہ چلتی سواری پر نماز پڑھ لیں اور اعادے کی حاجت نہیں- اس لیے کہ سارے شتر بانوں کا مقررہ قاعدہ صرف دو بار رکنے کا تھا، جس کی وہ پابندی کرتے - شتر بان سب بندے تھے، ہر ایک کو عصر و مغرب کے اوقات میں اپنا اونٹ روکنے کا پورا اختیار تھا، ان کے اوپر حکومت یا حکومت کے کسی محکمے کی جانب سے کوئی پابندی نہ تھی، نہ کسی جرمانے یا جیل جانے کا کوئی خطرہ، بس وہ اپنے مقررہ ضابطے کے باعث مذکورہ اوقات میں سواریاں نہ روکتے - یہ نہ روکنا ان بندوں کا اپنا مصنوعی اور اختیاری عمل تھا، اس لیے اسے منع من جہ العباد قرار دے کر سواری پر ادا کی ہوئی نماز کے اعادے کا حکم ہو سکتا تھا، مگر نہ ہوا- حالاں کہ اس سواری پر صرف استقرار علی الارض اور اتحاد مکان کی شرط ہی فوت نہ ہوتی تھی، کئی رکن اور فرض بھی فوت ہوتے تھے یعنی قیام، رکوع، سجود، قومہ وغیرہ بروجہ معروف ادا ہو جاتے ہیں- شرط کے ساتھ مذکورہ فرائض فوت ہونے کا تقاضا تو اور سخت تھا کہ اونٹوں پر بروجہ ممکن نماز ادا کرنے کے بعد اعادہ کا حکم ضرور ہو- اگر کہا جائے کہ مسافر کو تنہا اترنے میں جان و مال کے ضیاع کا اندیشہ تھا اس لیے یہ 'منع من جہ العباد' نہ قرار پایا تو ہم کہیں گے کہ یہ خطرہ بھی تو ان شتر بانوں کے سواریاں نہ روکنے ہی کی پیداوار ہے، اس لیے اس کی نسبت بھی بندوں ہی کی طرف ہونی چاہیے، پھر اس طرح کا خطرہ تو آج ٹرینوں سے اترنے میں بھی موجود ہے- کم از کم شقیق نفس، مال کی بربادی، ریزرویشن ٹکٹ کا نقصان، وقت کا ضیاع، مقصد سفر کی ناکامی، یا مشکلات کی افزونی تو ضرور موجود ہے- اس کے باوجود اگر ٹرین ہی پر نماز پڑھوا کر اعادہ کروانا ضروری ہے تو اونٹوں پر بھی نماز پڑھوا کر اعادہ کا حکم ہونا چاہیے تھا- غور کیجیے تو وجہ یہی ہے کہ شتر بانوں کا مقصد حنفیوں کو نماز سے روکنا نہ تھا، انھیں صرف منزل تک پہنچنے پہنچانے سے سروکار تھا، اس معاملے میں ان کا سلوک حنفی غیر حنفی سب کے ساتھ یکساں تھا، اس لیے ان کے منع کو منع من جہ العباد قرار نہ دیا گیا اور اعادِ نماز کا حکم نہ ہوا-

اب یہی حال ٹرینوں کا ہو چکا ہے، لوگ برق رفتار ٹرینوں کا سفر منزل تک جلد پہنچنے کے لیے اختیار کرتے ہیں- اس کے لیے مقررہ کرایہ ادا کرتے ہیں، جو بعض ٹرینوں اور بعض کلاسوں میں بہت زیادہ ہوتا ہے- محکمہ ریلوے بھی چاہتا ہے کہ مسافروں کو ان کی منزلوں تک جلد پہنچایا جائے، اس لیے کہ اسی غرض سے وہ ہمیں کرایے کی رقم ادا کر رہے ہیں- کسی کو نماز یا دیگر ضروریات سے روکنا مقصود نہیں ہوتا - جیسے مسلسل شتر رانی سے شتر بانوں کا مقصد حنفیوں کو نمازوں سے روکنا نہیں ہوتا تھا بلکہ اپنے مقررہ قاعدے کے مطابق منزل تک جلد پہنچانا ہوتا تھا تو اب ٹرینوں کے سفر میں بھی وہی حکم ہوگا جو اگلے زمانے میں اونٹوں پر سفر کا تھا- اب یہاں بھی اعادۂ نماز کا حکم نہیں- اس مسئلے کو سیمینار میں واضح کر دیا گیا اور فتاوی رضویہ کا مفہوم بھی عیاں کر دیا گیا- غور کیجیے کہ چلتے اونٹوں پر نماز پڑھنے میں شرط کے ساتھ کئی کئی فرض فوت ہوتے تھے پھر بھی بشمول امام احمد رضا قدس سرہ فقہائے احناف نے جواز بلا اعادہ کا حکم دیا، مگر ان کی پیروی کرتے ہوئے مجلس شرعی نے عصر حاضر کی ٹرینوں پر جواز بلا اعادہ کا حکم دیا تو ہمارے مہربانوں نے نہ صرف یہ کہ ''چلتی ٹرین'' بلکہ ''پوری ریلوے لائن'' سر پر اٹھا لی اور یہ مسئلہ دارالافتاؤں اور دانش گاہوں سے نکال کر سخت ہنگامہ خیز حالت میں بازاروں، ہوٹلوں اور سڑکوں پر کھڑا کر دیا- فالی اللہ المشتکی-

اب اگر کوئی یہ کہے کہ ریلوے نظام میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی، سو سال پہلے جو نظام تھا وہی آج بھی رائج ہے تو ریلوے نظام کا کوئی واقف کار اس دعوے پر اچھا تبصرہ کر سکتا ہے، ہم تو سکوت ہی میں عافیت سمجھتے ہیں، الغرض اگر کوئی سمجھنے کے لیے آمادہ نہ ہو، یا سمجھ بوجھ کر نہ مانے تو منوا دینا، نہ ہماری ذمہ داری ہے نہ اعلی حضرت قدس سرہ کی- مصرّف القلوب رب العزت جل جلالہ ہے، و بیدہ ازمّۃ المور-

بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ جب آج کی برق رفتار ٹرینوں میں کل یا بعض نمازوں کی شرعی ادائیگی نہ ہونا بالکل یقینی ہے تو قصداً ان کا سفر اختیار کرنا جائز ہے یا سخت ناجائز و حرام؟ ایسے سائلین کی کامل تفہیم و تشفی کی بھی فکر ہونی چاہیے-

میں یہ بھی صراحت کر دوں کہ ٹرینوں کا نظام اور ان پر نمازوں کے جواز یا عدم جواز کا مسئلہ قرآن و حدیث کا کوئی منصوص مسئلہ نہیں، ایک نیا اور فرعی مسئلہ ہے، جس میں اگر کوئی فریق دلیل کی تطبیق و تفہیم

میں خطا کر جائے تو اسے گمراہ یا فاسق ٹھہرانا روا نہیں۔

اسی لیے حضرت محدث سورتی علیہ الرحمہ یا اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے اس مسئلے کی بنیاد پر اپنے دور کے ان لوگوں کو فاسق یا گمراہ نہ کہا جو چلتی ٹرین پر نماز کے جواز بلا اعادہ کے قائل تھے۔ مگر آج کل اسی فرعی مسئلے کی بنیاد پر بعض لوگوں نے تفسیق وتضلیل کی مہم جاری کر رکھی ہے۔ **فیا للعجب!** خیر یہ تو ایک نیا مسئلہ ہے، سجدۂ تعظیمی کی حرمت تو ایسا قدیم اور مستحکم مسئلہ ہے کہ امام اہل سنت علیہ الرحمہ نے **الزبدة الزكية فی تحریم سجود التحیة** میں اس پر آیات وتفاسیر کے علاوہ چالیس حدیثیں اور ڈیڑھ سو فقہی نصوص پیش کیے ہیں، چاروں مذاہب کے ائمہ کا اس پر اجماع بتایا ہے، مگر سرکار مفتی اعظم قدس سرہ نے صراحت فرمائی ہے کہ مخالفین حرمت کی پیروی میں سجدۂ تعظیمی کا ارتکاب کرنے والوں پر حکم تفسیق نہیں۔ دیکھیے فتاویٰ مصطفویہ، ص:۴۵۶، اور فقہ حنفی میں حالات زمانہ کی رعایت ص:۱۲/۱۱۔

کیا سرکار مفتی اعظم علیہ الرحمہ نے محض اندھیرے میں تیر چلایا ہے؟ اور مرتکبین سجدۂ تعظیمی کی ناروا رعایت سے کام لیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ واللہ ان کی یہ شان نہیں۔

یہ شان ہمارے کرم فرماؤں کی ہے جنھوں نے آج کے نو پیدا فرعی مسئلہ چلتی ٹرین پر نماز سے متعلق جواز بلا اعادہ کے قائلین کو فسق و ضلال تک پہنچانے کی جسارت کی ہے اور ان کے پیچھے نماز کی ادائیگی ناجائز لکھی ہے۔ نہ خدا کا خوف، نہ رسول سے حیا، نہ مرشد سے شرم، نہ مرشد کے مرشد کا پاس ولحاظ۔ فتویٰ نویسی کا نہ کوئی ضابطہ رہا نہ اصول، ایک فرعی مسئلے کو حسام الحرمین کا درجہ دے کر ملک بھر سے دستخطوں کا انبار جمع کر کے عصر حاضر کا ''الصوارم الہندیہ'' بنا کر شائع کر دیا اور بزعم خویش نغمہ زن ہیں کہ

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

اپنے ہی بھائی ہیں، اس لیے دعا کرتا ہوں کہ رب کریم انھیں فقاہت وبصیرت عطا کرے اور سرکار مفتی اعظم قدس سرہ اور امام اہل سنت قدس سرہ کی پیروی نصیب فرمائے۔

یہ تو ہمارے دور کی بات ہے: مفتی اعظم قدس سرہ اور جمہور علمائے اہل سنت لاؤڈ اسپیکر پر نماز کی اقتدا ناجائز کہتے تھے۔ میں بھی اسی کا قائل ہوں۔ مفتی سید افضل حسین مونگیری صدر المدرسین جامعہ منظر اسلام بریلی شریف اور مفتی محمد جہانگیر اعظمی استاذ جامعہ منظر اسلام جواز کے قائل تھے۔ مفتی افضل حسین علیہ الرحمہ نے اس موضوع پر کتاب بھی لکھ کر شائع کی مگر مفتی اعظم علیہ الرحمہ نے ان حضرات یا ان کے متبعین پر نہ حکم فسق عائد کیا نہ بریلی کے سنی مسلمانوں کو ان کی اقتدا سے روکا، نہ اپنی اجازت وخلافت سے محروم کیا۔ کیا ہمارے کرم فرماؤں کی فقاہت یا دینی حمیت یا پرہیزگاری اور تقویٰ سرکار مفتی اعظم قدس سرہ سے فزوں تر ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں، بلکہ معاملہ برعکس ہے۔

ان معروضات کے بعد مجھے الجامعۃ الاشرفیہ کے دینی تصلب، فروغ سنیت میں اس کے نمایاں کردار اور رضویات کے باب میں اس کی روشن خدمات کا ذکر کرنا تھا اور یہ بتانا تھا کہ آج بھی اشرفیہ کے قادری، چشتی، نقشبندی، برکاتی، رضوی، اشرفی، رشیدی (وغیرہ) فرزندوں اور غلاموں میں وہی جذبات موجزن ہیں جو کل تھے، مختلف بلاد وممالک میں آج بھی وہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ اور اکابرِ اہل سنت کا نام روشن کر رہے ہیں اور پوری قوت کے ساتھ آج بھی وہ ہر باطل سے نبرد آزما ہیں۔

اس کا ایک نمونہ یہ جامعہ قادریہ پونہ بھی ہے جس کے زیر اہتمام آج ہم یہاں جمع ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ ان کرم فرماؤں کی پیہم یورشیں بھی ان شاء اللہ ارکانِ اشرفیہ اور ابنائے اشرفیہ کو بد مذہبوں اور بے دینوں کی دسیسہ کاریوں سے اہل سنت کو بچانے اور اشاعت مسلک حق کی راہ میں اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ سرگرم سفر رہنے سے غافل نہیں کر سکتیں، **و هو المستعان و عليه التكلان**۔

اشرفیہ کی خدمات کا موضوع ایک مستقل مضمون، بلکہ ایک ضخیم کتاب کا متقاضی ہے، اس لیے یہ کام کسی جواں سال عزیز کے لیے چھوڑتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو کوئی فرزند اس موضوع کو اپنے شاداب قلم سے سیراب کر کے دنیا کی نگاہوں کو آسودہ کرے گا۔ **و التوفيق بيد المولى الكريم العزيز۔ منه البداية و اليه النهاية۔**

حضرات! یہ عیسوی سال رواں اور ہجری سال ماضی وحال اہل سنت کے لیے ''عام الحزن'' کی شکل اختیار کر گیا۔ ہماری کئی عظیم ہستیاں صرف دو ماہ کے عرصے میں ہم سے پے بہ پے روپوش ہو گئیں۔ میں یہاں صرف چار ناموں پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) اجمل العلما مفتی محمد اجمل شاہ سنبھلی مرادآبادی کے شاگرد

مفتی محمد اشفاق حسین نعیمی سنبھلی مرادآبادی مفتی اعظم راجستھان ، سربراہ اعلی دارالعلوم اسحاقیہ جودھ پور، تاریخ رحلت: ۹؍ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ/ ۱۵؍اکتوبر ۲۰۱۳ء، سہ شنبہ-

(۲) امام علم وفن علامہ خواجہ مظفر حسین رضوی پورنوی شاگرد ملک العلما علامہ ظفر الدین رضوی بہاری، شیخ الحدیث دارالعلوم نورالحق چرا محمد پور، فیض آباد، تاریخِ رحلت: ۱۴؍ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ/ ۲۰؍اکتوبر ۲۰۱۳ء، یک شنبہ-

(۳) شہزادۂ سید العلما حضرت سید شاہ آل رسول حسنین میاں نظمی، سجادہ نشین سرکار عالیہ مارہرہ شریف، مقیم عروس البلاد ممبئی، تاریخِ رحلت: یکم محرم الحرام ۱۴۳۵ھ/ ۶؍نومبر ۲۰۱۳ء، چہار شنبہ-

(۴) حضرت مولانا نصر اللہ رضوی مصباحی- میرے عزیز اور ہم وطن- استاذ مدرسہ فیض العلوم محمد آباد گوہنہ، تاریخِ رحلت: ۴؍محرم ۱۴۳۵ھ/ ۹؍نومبر ۲۰۱۳ء، شنبہ-

یہ سبھی حضرات جامعہ اشرفیہ اور مجلس شرعی کے ہمدرد اور کرم فرما تھے، ان کے تعارف اور خدمات پر ماہنامہ اشرفیہ میں مضامین آ چکے ہیں اور کچھ آنے والے ہیں- رب کریم ان کی خدمات جلیلہ کو شرف قبول سے نوازے، ان کے درجات بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل واجر جزیل عطا فرمائے-

حضرات! مجھے احساس ہے کہ میں نے آپ کا وقت زیادہ لے لیا اب آپ کو آج کے موضوع مذاکرہ کی طرف متوجہ ہونا ہے- میں نے کئی مقالات کا مطالعہ کرلیا ہے اور تلخیصات تو سبھی پڑھ لی ہیں- مسائل کی صعوبت اور رایوں میں اختلاف نمایاں ہے، مگر میں آپ سبھی حضرات کی خدمات میں ہدیہ تحسین پیش کرتا ہوں کہ آپ نے چھان بین کی، کتابوں کی مراجعت فرمائی اور اپنے اپنے موقف کو حسبِ وسعت دلائل سے آراستہ کیا- فیصلہ جو بھی ہو مگر آپ کی کاوشیں رائیگاں جانے والی نہیں- ان علمی کاوشوں کا اجر اِن شاء المولی تعالی ضرور ملے گا- فیصلہ بھی آپ ہی کو کرنا ہے اور پوری بالغ نظری، متانت وسنجیدگی، خلوص وللّٰہیت اور قوتِ دلیل کے ساتھ کرنا ہے- رب کریم وجلیل سب کے سینے کشادہ فرمائے اور ہم سب کو ہر مسئلے میں روے حق وصواب سے شاد کام فرمائے- **وما ذلک علیه بعزیز-**

آخر میں یہ بھی عرض کردوں کہ ہمارے بلند ہمت اور با سعادت منتظمین آپ کی راحت وضیافت اور خاطر داری کی حتی المقدور کوشش کر رہے ہیں اور آپ کے قیام تک مصروف عمل رہیں گے، مگر نئے تجربہ کار ہیں اس لیے اگر کوئی فروگذاشت ہو تو انھیں اور ہمیں اپنی عالی ظرفی سے معاف فرمائیں اور بر وقت جو مناسب ہدایت و رہنمائی ہو سکتی ہو اس سے ہماری دستگیری فرمائیں اور جملہ معاونین کو اپنی مخلصانہ دعاؤں سے نوازیں- **و السلام و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین و الصلاۃ و السلام علی سید المرسلین خاتم النبیین و علی آله و صحبه و مجتهدی شرعه و مجاهدی دینه و علماء امته و متبعی سنته جمعین-** □□□

محمد احمد مصباحی

صدر: مجلس شرعی: جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

☆صدر المدرسین: جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ (یوپی)

محمد رضاء الحسن قادری ☆

مولانا ابوالکلام آزاد کے والد ماجد

مولانا خیرالدین خیوری دہلوی

اور ۱۲۰ رسال کے بعد اُن کے رسائل کی مکرر اِشاعت

پیش ازاں:

قبل اس کے کہ صاحبِ تذکرہ کے احوال وفضائل قرطاس کی نذر کیے جائیں ایک تمہید بیان کرنی مناسب ہے، جس سے شخصیت کی اہمیت مزید عیاں ہوجائے گی اور اِس تذکرے کے لکھنے کی ضرورت بھی واضح ہوگی۔

مولانا خیرالدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء) کا نام تو سبھی جانتے ہوں گے، اُن کے چند کارہائے نمایاں سے بھی واقف ہوں گے، اُن کی ایک آدھ کتاب کو بھی نام سے جانتے ہوں گے، ان کے بعض عقائد ومعمولات کا تذکرہ بھی کئی بار سنا ہوگا، اُن کے محبوب مشغلۂ ردِ وہابیت کا تو بچے بچے کو علم ہے۔ بس یہ ہمارے ہاں مولانا کی شخصیت پر حرفِ آخر ہے۔ افسوس کہ سال ہا سال بیت گئے لیکن مولانا دہلوی کا تعارُف اِس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اُن کی وفات کو ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا، مگر اُن کی کوئی ایک بھی مکمل تصنیف دوبارہ نہیں چھپ سکی۔

کیا کسی شخصیت کے تعارُف کے لیے اِتنا کافی ہے کہ فخر و مباہات کے لیے جذبات انگیز لہجے میں اُن کے قصے سنا دیے جائیں؟ عوامی محافل میں منابر پر براجمان ہوکر کچھ سنے سنائے واقعات کو دُہرادیا جائے؟ نجی مجالس میں انھی بعض باتوں کو بیان کرنے کا اِہتمام کیا جائے جنھیں سن کر کان اوب چکے ہوں؟ اور اس سے آگے کوئی حرکت نہ ہو؟

وقت کے ساتھ ساتھ مولانا خیرالدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو نااِنصافیاں ہوئی ہیں اُن میں سب سے بڑی نااِنصافی اُن کے سوانح زندگی سے اِغماض ہے۔ اِس دور میں مولانا ابوالکلام آزاد پر ری سرچ کرنے والے سب سے بڑے محقق ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری (ڈائریکٹر ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کراچی) اِس بارے میں رقم طراز ہیں:

''اِس بات کا مجھے ایک بار نہیں، کئی بار خیال آیا، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آپ بھی غور فرمایئے!

ان کے خاندان کی تاریخ موجود ہے، لیکن ان کے قریبی بزرگ چچا، تایا ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے حجاز ہجرت کر گئے تھے۔ ان کے والد اور والدہ کا ان کی تین چار برس کی عمر میں اِنتقال ہوگیا تھا اور ان کی پرورش اور تعلیم وتربیت ان کے نانا حضرت منورالدین نے کی تھی جو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے تلامذہ میں سے تھے، مفتی صدرالدین آزردہ کے نہایت قریب وعزیز دوستوں اور شرکاے درس میں سے تھے، حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی کے نہایت قریبی دوستوں میں سے تھے۔ نیز یہ کہ حضرت علامہ شاہ اِسمٰعیل شہید کے حریف بذلہ تھے۔ دہلی میں ان کی شادی ہوئی، ان کی اولاد تھی، ان کا اپنا گھر، اپنے پیچھے چھوڑے خاندان کے باقیات کو قصور جا کر دہلی لائے تھے اور اپنے ساتھ انھیں آباد کیا تھا۔ ان کے حالات، تذکار اور تاریخ کہاں ہے؟

ہمارے موضوع علیہ بزرگ حضرت علامہ مولانا خیرالدین رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا ایک گھر تھا، محلّہ تھا، گلی کوچے تھے، اس میں بیسیوں بچے تھے، جن کے ساتھ وہ کھیلے ہوں، عمر کا ایک حصہ ان کے ساتھ گزارا ہو، وہاں کے مکتب میں پڑھا ہوگا، ان کے شریک درس طالب علم ہوں گے اور یہ سلسلہ اعلیٰ درجات اور فراغت علمی کا ایک مقام حاصل کیا ہوگا۔ وہ سب کہاں گئے؟ آیا اس کا کوئی سراغ ملتا ہے؟ حضرتؒ جب دہلی سے اپنے نانا کے ساتھ حجاز کے لیے عازم سفر ہجرت ہوئے ہوں تو وہ ۲۶، ۲۷ برس کے نوجوان ہوں گے اور فراغت تعلیم کے بعد انھوں نے ۵، ۶ برس لازماً عیش و

فراغت یا عملی زندگی ہوگی- آیا اس کی کوئی تاریخ ہے؟ اگر نہیں تو حضرت مولانا خیرالدین کے عقیدت مندوں اوران کے پرستاروں اور محی الدین ابوالکلام آزاد دہلوی کے شیدائیوں کے لیے بھی بہت بڑی چنوتی ہے جو ان سے جواب طلب کرتی ہے-''

(حضرت شیخ خیرالدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ؛ ایک عجیب بات)

محترم راجا رشید محمود (صدر ایوانِ نعت/ ایڈیٹر ماہ نامہ ''نعت''، لاہور) نے اِس کوتاہی کا زیادہ تر ذمہ دار خود اُن کے صاحب زادے مولانا ابوالکلام آزاد کو ٹھہرایا ہے- اُن کی تحریر کا ایک طویل لیکن دل چسپ اور پُر مغز اِقتباس درج کیا جاتا ہے جو اُنھوں نے تمام معاملے کا جائزہ لینے کے بعد حاصل بحث کے طور پر لکھا ہے- وہ فرماتے ہیں:

''مولانا خیرالدین خیوری دہلوی رحمۃ اللہ علیہ برعظیم پاک و ہند کی مظلوم ترین شخصیتوں میں سے ہیں- ان کا تبحر علمی، درس و تدریس اور وعظ و تذکیر میں ان کی مخلصانہ کاوشیں، مختلف علوم میں ان کی منتہیانہ حیثیت، تصنیف و تالیف میں ان کی نمایاں کارکردگی، علم و دانش اور تبلیغ و فروغِ شعائرِ دینی کے لیے مختلف ممالک میں ان کے اسفار......ان میں کون سی ایسی عادت یا کوشش تھی کہ ان کے حالات کو پردۂ اِخفا میں رکھا جاتا- اگر اولاد میں سے کوئی غیر معمولی ذہانت و ذکاوت کا حامل تھا اور بہ وجوہ اپنے والد سے مختلف راستے کا راہی بنا تو کیا اس کے لیے یہ بھی ضروری ٹھہرا کہ وہ اپنے والد کے حالات نہ لکھے، خود کو شاعر کہلوانے کے شوق میں والد کی شاعری ہی کو تسلیم نہ کرے اور پھر، والد کی دین سے گہری وابستگی اور محبت کی دشمنی میں ہندوؤں کا تابع مہمل بن جائے- والد کا دینی تشخص اور علمی تخصص اسے غیر مسلموں کو منبر رسول ﷺ پر بٹھانے، ان سے مدرسوں، مسجدوں کا اِفتتاح کروانے اور انھیں خوش کرنے کے لیے تفسیری ''اِجتہاد'' پر اُکسائے- اسے اپنے والد کی محبتِ رسول ﷺ، تحفظ ناموس رسالت کی کوششوں سے ناپسندیدگی اس کے مخالف جادے پر گام زن کردے، یہ کیا کہ والد اگر اپنے آقا و مولا حضور رسولِ اکرم ﷺ کی شان کے خلاف کوئی فقرہ، لفظ یا شوشہ برداشت نہ کرنے کی غیرتِ ایمانی رکھتا ہو تو بیٹا قادیانیوں سے ربط ضبط قائم کرلے-

ہم دیکھتے ہیں کہ اولاد بعض اوقات اپنے ماں باپ کی راہ سے الگ یا مختلف راہ بھی اپنا لیتی ہے اوراس کے لیے کوئی مذہبی، سیاسی یا اخلاقی جواز بھی رکھتی ہے یا تلاش کر لیتی ہے- بعض ناخلف اپنے والدین سے دشمنی کی حد تک بھی چلے جاتے ہیں لیکن اِس مخاصمت کی مثالیں کم ملتی ہیں کہ کوئی دین ہی کی نئی تعبیر کردے یا اِسلام اور پیغمبر اِسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عزت و ناموس ہی کو داؤ پر لگادے-

ابوالکلام مولانا خیرالدین کی دِین سے محبت و عقیدت سے یوں نفور ہوئے کہ ہندو مسلم اِتحاد سے آگے بڑھ کر متحدہ قومیت کے پرچارک بن گئے- حضور رسولِ کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے میرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں اچھے خیالات کا اِظہار کرنے لگے، اس کے جنازے میں شریک ہوئے، قادیان میں ان کے پیچھے نماز پڑھی- ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے ''رنگیلا رسول''، قسم کی کتابوں کی اِشاعت پر مسلمانوں کو غیرت وحمیت کا مظاہرہ نہ کرنے کی تلقین کی......اور پتا نہیں کیا کیا-

مولانا خیرالدین تصوف کے داعی تھے، پیر طریقت تھے، ان کی حضورِ پرنور ﷺ سے محبت واضح ہے، تبلیغ دین میں ان کی کاوشیں سامنے ہیں، انھوں نے حضور فخر موجودات باعث ظہورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آباء واُمہات کے اِیمان پر دلائل و براہین سے پُر کتاب لکھی، وہابیوں کے خلاف تصنیف و تالیف اور زبان و بیان کے ذریعے آواز اٹھائی، ناموسِ صحابہ اور ناموسِ اہل بیت کی حفاظت کے لیے کارروائیاں کیں، حرم کعبہ میں وعظ کرتے رہے، قرآنِ مجید کے معارف و غوامض پر سال ہا سال درس دیا، شاید نقش بندی سلسلے کے مجاز تھے لیکن وحدت الوجود کا پرچار بھی کرتے رہے- کسی کو ان سے مسلک یا

کسی موضوع کے اعتبار سے اختلاف ہو تو اس کا اظہار کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کے تذکرے ہی سے اِغماض کا کیا جواز ہے- کچھ لوگوں نے ابوالکلام پر لکھتے ہوئے چند سطروں یا چند پیروں میں ان کی بات کی ہے- اسی طرح جہاں مجبوری آن پڑی ہے' وہاں ابوالکلام نے بھی اچھا یا بُرا' ان کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کے کچھ حالات سب سے پہلے پروفیسر سیّد شفقت رضوی نے خاندانِ ابوالکلام کے حوالے سے بیان کیے اور اب راقم الحروف نے ان کی نعت گوئی کو سامنے لانے کی نیت سے کام کیا ہے- ربِّ کریم ان کی دین' شعائرِ دین اور سرکارِ ابدقرار ﷺ سے محبت و عقیدت کو قبول فرمائے اور ان کی خامیوں' غلطیوں سے درگزر فرمائے-

ابوالکلام کو جتنی والہانہ محبت ہندوؤں' ہندوازم اور قادیانیوں سے تھی' کاش اس کا دس واں بیس واں حصہ اپنے والد سے ہوتی ؟''

(ماہ نامہ ''نعت''، لاہور: مولانا خیرالدین اور اُن کی نعت گوئی، جلد ۱۸ شمارہ: ۲، فروری ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۷-۱۰۸)

یہ ہے معاملے کی صحیح صحیح صورتِ حال- اِس سے جہاں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا خیرالدین دہلوی پر کام ہونا کیوں اور کتنا ضروری ہے وہاں مولانا ابوالکلام آزاد اور اُن کے والد کے کردار کا فکری و شخصی موازنہ بھی سامنے آجاتا ہے- نیز مولانا آزاد کے اپنے والد سے ناروا طرزِ عمل کا پردہ بھی فاش ہو جاتا ہے-

مولانا خیرالدین پر دو وجہ سے کام ہونا نہایت ضروری ہے:

ایک تو خود اُن کے ذاتی مقام و مرتبہ کے لحاظ سے-

دوسرا اُن کی فکر کو قبول کرنے والوں نے بہ وجہ غفلت اور اُنھیں تسلیم نہ کرنے والوں نے بہ کوشش مخفی رکھا ہے-

اِسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے محترم راجا رشید محمود صاحب نے پہلی مرتبہ مولانا خیرالدین کی زندگی پر قلم اُٹھایا اور پوری دقت و تحقیق کے ساتھ اُن کے سوانح حیات کو وقیع طور پر جمع کیا ہے، نیز اُن کی نعت گوئی کی جہات پر بھی روشنی ڈالی ہے- یہ کام واقعی قابل قدر ہے جو ۲۰۰۵ء میں سامنے آیا- اِس سے پہلے ۲۰۰۲ء میں عزت مآب ڈاکٹر اسحٰق قریشی نے ان کی عربی نعتیہ شاعری پر اپنے پی ایچ. ڈی مقالے ''برصغیر پاک و ہند میں عربی نعتیہ شاعری'' میں مفصل مقالہ پیش کیا تھا اور اب ۲۰۱۳ء میں اللہ عزوجل کی توفیق سے دارُ الاسلام، لاہور (پاکستان) نے ۱۱۹ رسال بعد اُن کے چار رسائل کا مجموعہ شائع کر دیا ہے- یہ کیسا دل نشیں اِتفاق ہے کہ یہ صدی بہ مقابلہ پچھلی صدی کے مولانا خیرالدین کے لیے بہت بہتر ثابت ہوئی- اس پر طرہ یہ کہ روایت کے علی الرغم حضرت مولانا کو متعارف کرانے اور ان کے افکار و آثار کے اِحیا کا اِعزاز و اِکرام اِس بار اُس طبقے کے حصے آیا ہے جو اپنی شخصیات کو نسیا منسیاً کرنے میں سب سے زیادہ ماہر اور مشہور ہیں- والحمدللہ علی ذٰلک-

ذیل میں سب سے پہلے مولانا خیرالدین کے مختصر حالات اور پھر ان رسائل کی اِشاعت کے حوالے سے کچھ باتیں شامل مضمون کی جائیں گی-

مختصر حالاتِ زندگی (خاندانی شرف):

حضرت شیخ خیرالدین دہلوی صدیقی النسب تھے اور ہند و حجاز کے تین ممتاز علمی گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے:

۱- آپ کے والد شیخ محمد ہادی دہلی کے ایک مشہور خاندانِ علم و فضیلت سے تعلق رکھتے تھے' جس میں بہ یک وقت پانچ پانچ علماے درس و اِفتا و اصحابِ سلوک و طریقت پیدا ہوئے ہیں-

۲- نانا رُکن المدرّسین مولانا منورالدین دہلوی اپنے عہد کے مشاہیر اساتذۂ علم و درس اور اصحابِ طریقت و سلوک میں سے تھے اور اُن مخصوص اصحابِ کمال میں سے تھے جن کو اللہ تعالیٰ علومِ ظاہر و باطن کی جامعیت عطا فرماتا ہے-(۱)

۳- ماموں سسر مفتی مدینہ منورہ شیخ محمد بن ظاہر وتری جو گزشتہ دور کے اکثر علماے حجاز کے اُستاذِ حدیث اور شیخ عبداللہ سراج کے بعد مکہ معظّمہ کے آخری محدث تھے- ان کے بعد اس درجے کا کوئی شیخ الحدیث حرمَین میں پیدا نہیں ہوا-

(تذکرہ: ابوالکلام آزاد، مرتبہ مالک رام، ص ۲۵-۲۶، اِسلامک پبلشنگ ہاؤس، لاہور)

پیدائش، تربیت، تعلیم:

آپ کی پیدائش ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۱ء میں بہ مقام دہلی ہوئی- ابھی آپ عمر کے چوتھے سال میں پہنچے ہوں گے کہ والد کا اِنتقال ہو گیا، کچھ

ہی عرصے کے بعد والدہ بھی رحلت کر گئیں- چناں چہ آپ کی تمام تر پرورش اور تعلیم وتربیت اپنے نانا کے زیرنگرانی ہوئی -مولانا منورالدین کے اپنے وقت کے جید علما سے گہرے مراسم تھے، لہٰذا لاڈلے نواسے کو ہر چشمۂ علم وحکمت سے آبِ فیض پینے کا شرف حاصل رہا- مولانا منور الدین دہلوی (متوفی ۱۲۷۵-۷۶ھ/ ۱۸۵۹-۶۰ء) کے علاوہ صدر الصدور دہلی مفتی صدرالدین خان آزردہ (متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء)، اِمامِ حکمت وکلام علامہ محمد فضل حق خیرآبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء)، شاہ محمد یعقوب دہلوی (متوفی ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۶ء)، شاہ محمد حلیم بلگرامی، مولوی محمد کریم (لال کوئیں والے)، مولوی محمد عمر، مولانا رشید الدین کے درِدولت سے آپ نے علم کی خیرات پائی- نیز شیخ عبداللہ سراج، شیخ محمد بن ظاہر وتری اور چند علمائے حجاز سے بھی درس لیا-

مشاغل:

مولانا خیرالدین نے بعض مردانہ ورزشیں اور تفریحی فنون بھی سیکھے- مثلاً پنجہ کشی میر پنجہ کش سے، تیراکی میر مچھلی سے، تیراندازی قلعہ معلّٰی ہی کے ایک اُستاد سے، اِسی طرح کشتی لڑنا سیکھا- تب حافظ امام بخش خط نسخ کے امام تھے ان سے خوش نویسی سیکھی- نشانہ اندازی، شمشیر زنی اور لکڑی کے فنون بھی سیکھے- اسی کا نتیجہ تھا کہ آخری وقت تک ان کا بدن کسرتی رہا-

(ابوالکلام آزاد: شورش کاشمیری، ص۱۴، مطبوعاتِ چٹان، لاہور ۱۹۹۹ء)

شادی، اولاد:

مولانا خیرالدین نے سن ستاون کی جنگ آزادی کے بعد حجاز کو ہجرت کی اُس وقت جب کہ آپ کے نانا کا اِنتقال ہوا- ہجرت کے ۱۰ سال بعد ۱۸۷۰-۷۱ء میں آپ کی شادی مدینہ منورہ میں شیخ محمد بن ظاہر وتری کی بھانجی زینب (متوفی ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۹ء) سے ہوئی جس کے بعد آپ نے مکہ مکرمہ کی شہریت اِختیار کرلی- اولاد میں تین بیٹیاں خدیجہ بیگم، فاطمہ بیگم آرزو (متوفی ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۶ء)، حنیفہ بیگم آبرو (متوفی ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) اور دو بیٹے ابوالنصر غلام یٰسین آہ دہلوی (متوفی ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء) اور (محی الدین فیروز بخت) ابوالکلام احمد آزاد دہلوی (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) تھے-

حرمِ مکہ میں درس:

کچھ عرصہ حرمِ مکہ میں درس دیتے رہے، ان سے پہلے کسی ہندوستانی کو یہ شرف حاصل نہ ہوا تھا-

(ابوالکلام آزاد: شورش کاشمیری، ص:۱۴)

ممالک اِسلامیہ کے دورے:

۱۸۹۴ء میں کلکتہ آ گئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے- ہندوستان آمد سے پہلے اور بعد آپ نے (قونیہ، قسطنطنیہ) ترکی، (قاہرہ) مصر، (بغداد) عراق اور دیارِ شام تا ایشیائے کوچک وجزیرۃ العرب کے طول و عرض میں کئی دورے کیے- کہیں کچھ ماہ کہیں کچھ سال قیام کیا- وہ خلافت کا دورِ عظیم تھا- خلیفۂ وقت اور شریفِ مکہ عبدالمطلب دونوں کے آپ معتمد تھے- حتیٰ کہ سلطان اور شریف کی آپس میں جب ناراضگی ہوئی تو سلطان نے اِس تعلق سے بعض واقعات کی تصدیق میں مولانا خیرالدین سے مدد چاہی- سلطان نے مولانا خیرالدین کو ''تمغۂ حمیدی'' سے بھی نوازا- دوسرے اعلیٰ حکومتی عہدہ داروں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے-

پیری مریدی:

جن علاقوں میں آپ قیام کرتے وہاں کے لوگ کثرت سے آپ کے مرید ہو جایا کرتے تھے- عرب ممالک کے علاوہ ہندوستان کے ہر بڑے شہر خصوصاً دہلی، بھوپال، بمبئی، کاٹھیاواڑ، گجرات، رنگون، کلکتہ میں ان کے بہت زیادہ مریدین موجود تھے- کلکتہ میں باوجود ضعیف العمری اور بیماری کے رُشد وہدایت کا سلسلہ جاری رکھا- وہاں آپ کے مریدوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی تھی- اس زمانے میں ایک ایک مجلس میں پانچ سو یا ہزار آدمی مرید ہوتے-

تصانیف:

آپ کی تصنیفات کے نام حسب ذیل ہیں:

۱-نجم المبین لرجم الشیاطین

(عشر مجلدات. اشهر مشاهير تصانيف الخيوری و اكبرها فی الرد علی الوهابية)

۲-البصائر العشرة الجلية لناظری الجزء الاول من العقائد الخيورية

۳-درج الدرر البهية فی ايمان الآباء و الامهات المصطفوية المعروف بالعقائد الخيورية(80 جز)

۴-خير الامصار مدينة الانصار

۵-الستة الضروريه فی المعارف الخيوريه
۶-حفظ المتين عن لصوص الدين
۷-اسباب السرور لاصحاب الخيور
۸-الاوراد الخيورية سلالة الادعية الماثورية
۹-تبيان عقائد الفريقين من اهل الحب و البغض فی الدارين
۱۰-سراجِ منیر ترجمہ تبصير الضرير
۱۱-تقلید کی بابت رسالہ
۱۲-خضر علیہ السلام سے متعلق مقالہ
۱۳-قصائد نعتیہ ومدحیہ ومقامات
۱۴-ترکی صرف ونحو
۱۵-عربی، فارسی، ترکی لغت (حرف 'فا' تک)
۱۶-ردِ نذیر حسین دہلوی
۱۷-مفصل خاندانی حالات

ردوہابیت:

مولانا خیر الدین دہلوی وہابیہ کے رد کرنے میں بڑے مشہور تھے- اگر ایک جامع جملے میں اُن کی تمام شہرت کو سمیٹنا چاہیں تو وہ یوں ہوگا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی ساری زندگی میں وہابیت کی اتنی حمایت نہیں کی ہوگی جتنی مولانا خیرالدین نے اُن کی مخالفت کی- درونِ خانہ گفت گو ہو کہ وعظ برسر منبر، مناظرہ کی بزم ہو یا تحریر کا میدان اُن کا موضوعِ سخن ردِ وہابیت ہوتا، عوامی اسٹیج ہو یا پھر حکومتی ایوان مولانا خیر الدین نے وہابیوں کی اصلیت ظاہر کرنے سے باز نہ آتے- حجاز میں اُنھوں نے وہابیت کے خلاف محاذ کھولا اور اِس سلسلے میں بڑے بڑے تنازعات سے گزر گئے- شریفِ مکہ نے ہندوستانی اکابرِ وہابیہ کو ۳۹،۳۹ کوڑے لگانے کا حکم آپ کے کہنے پر دیا، آپ ہی کی یہ دولت اُن کا وہاں رہنا ناممکن ہوگیا- قسطنطنیہ کے عوام کو وہابیوں کے باطل عقائد کا شعور دیا اور اُنھیں اُن کی مخالفت پر کمر بستہ کیا- ہندوستان میں جتنا عرصہ ٹھہرے یہاں بھی اُنھوں نے وہابیت کا جینا دوبھر کیے رکھا- اُن کے رد میں مستقل کتابیں لکھیں، بلکہ اپنی ہر کتاب میں ہی ان کی مذمت کی اور ان کے غیر اسلامی نظریات کا پردہ چاک کیا- مولانا خیرالدین ہندی وہابیوں کے بھی اتنے ہی مخالف تھے جتنے نجدی وہابیوں کے- وہ ردِ وہابیت کے شعبے میں اپنا جداگانہ تشخص رکھنے کے باوجود اپنے نانا مولانا منور الدین دہلوی کے پیش رو تھے، نیز حضرت سیف اللہ المسلول علامہ شاہ فضل رسول بدایونی اور تاج الفحول علامہ شاہ عبدالقادر بدایونی کو اپنا ہم مسلک گردانتے تھے- وہ کہتے تھے:

> ''گم راہی کی موجودہ ترتیب یوں ہے کہ پہلے وہابیت، پھر نیچریت، نیچریت کے بعد تیسری قدرتی منزل جو اِلحادِ قطعی ہے-''
>
> (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۳۵۹)

مولانا آزاد نے اِن الفاظ میں بھی اُن کے ردِ وہابیت کو بیان کیا ہے:

> ''جہاں تک مجھے خیال ہے وہ وہابیوں کے کفر پر وثوق کے ساتھ یقین رکھتے تھے- اُنھوں نے بارہا فتویٰ دیا کہ وہابیہ یا وہابی کے ساتھ نکاح جائز نہیں-''
>
> (ایضاً ص: ۱۴۷)
>
> ''ہم نے سینکڑوں مرتبہ والد مرحوم سے سنا کہ اُن کا کفر یہود ونصاریٰ کے کفر سے بھی اشد ہے- یہود ونصاریٰ بھی اپنے پیشواؤں کے منکر نہیں ہیں، یہ خبیث تو خود اپنے پیغمبر کے منکر ہیں-'' (ایضاً، ص: ۳۴۱)

اِس نوعیت کے بے اندازہ اِقتباسات ہم نے اِستخراج کر رکھے ہیں جو یہاں پیش کیے جانے کے قابل ہیں اور خود ابوالکلام آزاد کی زبانی ہیں، مگر خوفِ طوالت ایسا کرنے سے باز رکھتا ہے- راقم نے انھیں اپنے مضمون ''مولانا خیرالدین دہلوی اور وہابیت'' میں جمع کر دیا ہے، جو اِن شاءاللہ کسی دوسرے موقع پر شائقین کی نذر کیا جائے گا-

عادات وخصائل:

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے والد کے عادات وخصائل کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے، جسے اُن کے عقیدت مند عبدالرزاق ملیح آبادی نے روایت کیا ہے- اُس کی تلخیص راوی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

> ''اُن کے بہت سے عادات وخصائل ایسے تھے جو قابل ذکر اور گزشتہ سوسائٹی کی یادگار ہیں- مثلاً پابندیِ اوقات، اُن کی زندگی کے تمام اوقات اِس درجہ منتظم تھے کہ نشست وبرخاست، اکل وشرب، ملاقات وصحبت، تحریر وتقریر؛ اِن تمام باتوں کے لیے جو اوقات قرار پا گئے تھے

اُن میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی تھی- ہم لوگ ان کے اوقات سے گھڑی کی طرح وقت معلوم کرتے تھے اور جب کبھی دونوں میں اختلاف ہوتا تو گھڑی کو غلط سمجھتے تھے-

ایک بہت بڑی بات جو اُن کے یہاں پہنچ کر ہر شخص محسوس کر لیتا تھا وہ بندگانِ الٰہی کے ساتھ یکساں سلوک تھا، جس میں امیر' غریب کی کوئی تفریق نہ تھی، ملاقات کے لیے جس ہال میں سب لوگوں کو انتظار کرنا پڑتا تھا اُس میں صرف چٹائی فرش ہوتا تھا اور رئیس وغریب سب کو وہیں جا کر بیٹھنا پڑتا تھا، جس کمرے میں وہ لوگ ملتے تھے اُس میں دری کا فرش، ایک گاؤ تکیہ اور ایک چھوٹی سی گدی ہوتی تھی جس پر وہ خود چوبیس گھنٹے بیٹھتے تھے اور خواہ کوئی شخص آئے اُس کو وہیں اُن کے سامنے بیٹھنا پڑتا تھا-

اُن کی تعلیم وتربیت اُس سوسائٹی میں ہوئی تھی جو ہندوستان کی قدیم اسلامی تہذیب کی آخری یادگار تھی ...... اِس سوسائٹی، خاندانی وراثت اور ذاتی اعتدالِ طبیعت کی وجہ سے اُن کے اخلاق وعادات میں بہت سی باتیں ایسی جمع ہوگئی تھیں جو اِس زمانے میں کم نظر آتی ہیں- ازاں جملہ اُن کی خودداری تھی، عمر بھر کسی امیر ورئیس کی تعظیم نہیں کی اور بہ جز علما اور اپنے اساتذہ کے اور کسی کی تعظیم میں کبھی کھڑے نہیں ہوئے- کبھی کسی امیر کے دروازے پر نہیں گئے اور باوجود سخت اِلتجاؤں کے بھی کبھی اُمرا کی دعوتیں قبول نہیں کیں- ایک سال میں وہ کتنے مرتبہ اور کس کس کے یہاں جائیں گے؟ یہ بالکل ایک طے شدہ معاملہ تھا اور نہ گھٹتا تھا' نہ بڑھتا تھا-

سب سے زیادہ قابل ذکر واقعہ اُن کی بے لاگ اور بے باک حق گوئی کا ہے جو ہمیشہ اہل دُوَل کے مقابلے میں نمایاں رہتی تھی جن اشخاص کے متعلق اُن کو متنبہ کرتے تھے اور رعب وہیبت کا یہ حال تھا کہ اُنھیں سر جھکا کر سب کچھ سننا پڑتا تھا............ وہ غربا کی دعوتیں نہایت خوشی سے قبول بھی کر لیتے تھے، لیکن اہل دُوَل واُمرا سے اُن کا تعلق بالکل بے لاگ رہتا تھا اور ممکن نہ تھا کہ ایک ذرّہ بھر بھی دُنیاوی اِحسان ان کا اپنی گردن پر لیں، وہ لوگ آتے تھے، اپنے دینی ودُنیاوی معاملات پیش کرتے تھے اور ہر طرح کی اِعانت انھیں حاصل ہوتی تھی، لیکن وہ خود اُن سے کسی طرح کی اِعانت قبول نہ کرتے تھے- نتیجہ یہ تھا کہ اُن کو بادشاہوں کی طرح حکم دیتے تھے اور بے نیازوں کی طرح اُن کے گھمنڈ اور غرور کو ٹھکرا دیتے تھے- ہمیشہ ہم لوگوں کو نصیحت کرتے تھے کہ امیروں سے غرور اور غریبوں کے مقابلے میں عجز و نیاز؛ یہی صحیح عادلانہ اخلاق ہے- خود اُن کا عمل بھی ٹھیک یہی تھا- یہ بات کیسی تعجب انگیز سمجھی جائے گی کہ بڑے بڑے اُمرا تو برسوں تک اِس آرزو میں رہتے تھے کہ ایک مرتبہ اپنے یہاں لے جائیں اور نہیں جاتے تھے، مگر کتنے ہی غریب وفقیر اُن کے عقیدت مند ایسے تھے جن کے چھپر کے کچے مکانوں میں چلے جاتے تھے اور ماحضر قبول کر لیتے تھے- ......اگر ایسے آدمیوں کا شمار کیا جائے جو پریشانی وغربت کی حالت میں اُن کی دُعاؤں کے طالب ہوئے اور پھر اچانک اِنتہا درجے کی خوش حالی تک پہنچ گئے تو اُن کی تعداد اتنی وسیع ہے کہ شمار نہیں کی جاسکتی...... اُن کی نسبت یہ دُور دُور تک مشہور ہوگیا تھا کہ غریب آدمی اُن سے مرید ہوتا ہے اور دولت وسعادت لے کر واپس ہوتا ہے .... ہمیشہ ہزاروں آدمیوں کا اُن کے دروازے پر ہجوم رہتا تھا- بیمار شفا کے لیے آتے تھے، مفلس دولت کے لیے، مائیں اولاد کے لیے، کاروباری مشورے کے لیے اور اِس ہجوم میں خال خال وہ بھی ہوتے تھے جو خدا کی طلب میں آتے تھے- اِس کا بلاشبہ اُنھیں ہمیشہ سخت ماتم رہتا تھا- گھر میں بارہا ہم نے دیکھا کہ سرد آہیں بھرتے تھے اور کہتے تھے کہ تمام وقت طلب گارانِ دُنیا کے لیے صرف ہو جاتا ہے اور طلب گارِ آخرت کوئی بھی نہیں ملتا- اِسی وجہ وہ ایسے لوگوں کے بڑے خواہش مند وشائق رہتے تھے اور جو اس طلب میں آتے تھے اُن سے بڑی محبت کرتے تھے-

ایک خاص وصف اُن کی طبیعت کا جو اُن کو عام صف سے الگ کر دیتا ہے طبیعت کی فیاضی، سیر چشمی اور دریا دلی تھی، اُن کو دیکھ کر خیال نہیں ہوتا تھا کہ لوگوں سے لینے والے ہیں بلکہ ہر آنکھ محسوس کر لیتی تھی کہ لوگوں کے دستِ سوال پر اُن کا دستِ بخشش اُٹھا ہوا ہے- کوئی دن ہم نے ایسا نہیں دیکھا کہ کم سے کم پندرہ بیس آدمیوں نے اُن کے دسترخوان پر کھانا نہ کھایا ہو- طبیعت میں بے اِنتہا علو و بلندی تھی- دنایت و خست سے نہایت سخت نفرت کرتے تھے اور اسی کی ہم سب کو تلقین کرتے تھے، جو چیز لیتے قیمتی لیتے، جس کو کچھ دیتے زیادہ سے زیادہ دیتے، علما وفقرائے وقت میں سے کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو اُن سے ملا ہو اور جاتے وقت اُس کو اُنھوں نے ایک رُومال نہ دیا ہو جس کے کونے میں نوٹ بندھے ہوتے تھے-

اُن کی طبیعت میں مذاہب و اقوام کی نسبت بھی ایک عجیب طرح کی بے تعصبی تھی- ہزاروں ہندو، پارسی، یہودی، عیسائی عقیدت مندانہ اُن کے پاس آتے تھے اور اپنے مقاصد پیش کرتے تھے- اُن کے معتقدین میں بمبئی کے چند پارسی اور ہندو ایسا غیر معمولی اعتقاد رکھتے تھے کہ اُن کے اِنتقال کے بعد جب اُنھوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہم اُن کو کیوں کر خوش کر سکتے ہیں؟ اور مَیں نے کہا کہ مسلمان ہو کر! تو اُن میں سے ہزمزجی نرسی مسلمان ہو گیا- یہ ایک بہت بڑا دلال تھا-

اُن کی طبیعت میں یہ بات بھی تھی کہ ہمیشہ خوش پوشاک رہتے تھے اور اِس بارے میں بڑا خیال رکھتے تھے- نہایت قیمتی لباس پہنتے اور ہر طرح کا کپڑا جو گھر میں مستعمل ہوتا قیمتی سے قیمتی منگواتے تھے وہ ہم لوگوں سے کہتے تھے کہ یہ اللہ کی نعمت کا بہترین ذریعۂ شکر ہے اور اِمام مالک اور اِمام ابوحنیفہ کی خوش پوشاکی کے واقعات سناتے......'' (ایضاً ص: ۱۳۱ تا ۱۴۵)

وفات:

آپ کی وفات ۱۷ رجب ۱۳۲۶ھ/ ۱۵ راگست ۱۹۰۸ء بہ روز ہفتہ بہ عمر ۷۷ سال ہوئی- مانک تلہ کے قبرستان میں اپنی اہلیہ کی قبر کے پہلو میں دفن ہوئے- ''دبدبۂ سکندری''، رام پور میں یہ قطعہ تاریخ وفات درج ہے:

قضا کرد اُف مولوی خیر دین
فقیہ زماں اہل جوش و خروش
سنہ فوت چوں خواستم از خرد
بگفتا ''فضایل پناہ اہل ہوش''

آپ کی وفات پر دُنیا کے مختلف ممالک جنوبی افریقہ، ٹرانسوال، زنجبار، سیلون، برما، جاوا، سنگاپور، ہانگ کانگ، حجاز، شام، مسقط وغیرہ سے تعزیتی پیغامات آئے اور بعض جگہ جلسے بھی منعقد کیے گئے اور اخبارات میں ان کی رودادیں شائع ہوئیں-

(ایک علمی خاندان: سیّد شفقت رضوی، ص ۲۴، ۳۹، اِدارۂ تحقیقات افکار و تحریکاتِ ملّی پاکستان ۱۹۹۰ء)

''دارُالاسلام، لاہور (پاکستان)'' کا ایک لائق افتخار کارنامہ:

واعظین سے ہمیشہ ہم سنتے چلے آرہے ہیں کہ ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیرالدین دہلوی بہت بڑے علامہ تھے اور پکے سُنّی تھے اور پیر طریقت بھی تھے- اُنھوں نے وہابیوں کے رد میں ۱۰ر جلدوں میں کتاب لکھی، وہ بھی عربی میں-

بڑے بڑے جلسوں میں مقررین جب وہابیت کے خلاف مسالے دار اور دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں تو بڑے اِفتخار و استکبار سے اِس بات کو بیان کرتے ہیں- سامعین کا جوش تازہ کرنے کے لیے یہ رٹے رٹائے فقرے کافی ہوتے ہیں اور واعظِ قوم کو اِتنی داد مل جایا کرتی ہے کہ اُس کا ''پیٹ'' بھر جاتا ہے- خطبا کی گزر بسر اِن سماعی روایات پر اچھی طرح ہوتی رہی ہے، لیکن دستاویزات کا کوئی ایک ورق بھی شاید اِن حضرات کے پاس اب تک نہیں ہے جو ان کے دعویٰ کی توثیق کرے، ماسوائے نقل در نقل سوانحی کتابوں کے اِکا دُکا اِقتباسات کے- توقع کے مطابق اِس طبقے نے حضرت موصوف کی رشحاتِ قلم کو جمع کرنے کی زحمت بھی نہیں اُٹھائی ہوگی-

زمرۂ محققین سے حضرت خیرالدین دہلوی کے کارہائے قلم کی بازیابی کے لیے کوششیں ہوئیں بھی اور نہیں بھی- کسی حد تک اُنھیں اگر کام یابی مل بھی گئی تو بڑی دقت یہ ہوئی کہ کوئی باذوق ناشر اُنھیں نہ مل

سکا، اِس سرمایۂ جلیل کی قدر پہچاننے والا کوئی نجی یا سرکاری اِدارہ برائے نشر و اشاعت بھی مطلقاً نہیں پایا گیا- نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تراثِ علمیہ اپنی پہلی طبع کے بعد گوشہ گیر ہو رہی، جسے سوا صدی گزرنے کو ہے- اب بھی شاید برسوں بیت جاتے اور مولانا خیرالدین کی کتابوں جیسی لازوال دولت ہمارے ہاتھ نہ آتی، اگر اللہ جل جلالہ کی توفیق ''دارُ الاسلام'' لاہور کی رفیق نہ ہوتی- اِس نیک بختی پر ہم ربّ العزت عم نوالہ وعز مقالہ کا شکر بجالاتے ہیں-

الحمد للہ دارُ الاسلام لاہور (پاکستان) نے رجب ۱۴۳۴ھ/مئی ۲۰۱۳ء میں مولانا خیرالدین دہلوی کے چار رسائل کا مجموعہ شائع کر دیا ہے- اس کی تفصیل یہ ہے:

۱-خیر الامصار مدینة الانصار (۴۷رصفحات)
(مدینہ منورہ کے فضائل ومناقب منظوم ومنثور)
۲-الستة الضروریه فی المعارف الخیوریه (۴۶رصفحات)
(معرفتِ نفس کے متعلق چھے سوالات اور اُن کے جوابات)
۳-حفظ المتین عن لصوص الدین (۹۸رصفحات)
(در بارۂ اِطلاقِ لفظِ خدا بر غیرِ خدا اور شبہاتِ منکرین)
۴-اسباب السرور لاصحاب الخیور (۱۸۱رصفحات)
(مسائل وآدابِ دین مع قصیدہ نود ونہ (۹۹) نام ہائے غوثِ اعظم)

یہ مجموعہ رسائل 336 صفحات پر مشتمل ہے، جو اپنی پہلی طبع کا عکس ہیں- ان میں پہلے تین رسائل ۱۳۱۵ھ جب کہ رابع الذکر ۱۳۱۸ء میں بارِ اوّل طبع ہوئے تھے اور اب کم وبیش ۱۲۰رسال بعد دوبارہ منصۂ شہود پر جلوہ فرما ہوئے ہیں-

اِن رسائل کا اِنتساب مصنف کے نانا مولانا منورالدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام کیا گیا ہے، جنھوں نے سرزمین ہند میں وہابیت کے سفیرِ اوّل (شاہ اسمٰعیل دہلوی) کی تردید وتوبیخ میں پہل کی اور اِس قدر نمایاں کردار ادا کیا کہ اپنے دور کی تحریکِ ردِ وہابیت کے سالار تسلیم کیے گئے- اِن کے علاوہ مولانا خیرالدین کی یہ کتابیں بھی ہماری پہنچ میں ہیں:

۵-البصائر العشرة الجلیة لناظری الجزء الاول من العقائد الخیوریة (صفحات:۱۹۰)

۶-درج الدرر البهیة فی ایمان الآباء و الامهات المصطفویة (صفحات:۲۰۸)

اور دو فارسی کتابوں کے مخطوطات کے عکس ہمیں دست یاب ہوئے ہیں:

۷-تبیان عقائد الفریقین من اهل الحب و البغض فی الدارین
۸-سراجِ منیر ترجمہ تبصیر الضریر
(دونوں کے صفحات ساڑھے تین سو سے زائد ہیں)

قدرت کو منظور ہوا اور احباب کا ردِ عمل ہمت افزا ہوا اور کوئی معاملہ جگر فرسانہ ہوا تو اِن شاءاللہ اِن کی اِشاعت کے اسباب بھی جلد تلاش کر لیے جائیں گے-

مولانا خیرالدین دہلوی کے صدسالہ عرس کا خدائی اہتمام:

آج سے کامل پانچ سال قبل جب راقم ''دارُ الاسلام'' سے پہلی کتاب ''المبین'' شائع کرنے میں مشغول تھا- ابھی کچھ کام باقی تھا کہ سیّد محمد عبداللہ قادری ابن سیّد نور محمد قادری (واہ کینٹ) ہمارے یہاں تشریف لائے- وہ آئے اور اپنے ہم راہ ایک گراں قدر، گراں مایہ تحفہ لائے- اُس وقت ناچیز علم وتحقیق کی دُنیا میں نو وَارِد تھا- لائقِ اِحترام شاہ صاحب مجھے اپنے لائے ہوئے قیمتی تحفے کے بارے میں بتاتے رہے کہ یہ مولانا خیرالدین خیوری کی کتابیں ہیں، جو بہت بڑے عالم اور شاعر تھے، وہابیوں کا شدید رد بھی کرتے تھے وغیرہ- مَیں چُپ چاپ سنتا رہا اور جواباً سر ہلاتا گیا- چوں کہ اب تک مجھے ان جواہر پاروں کی حقیقی منزلت کا اِدراک نہیں ہوا تھا، اس لیے یہ میرے لیے کوئی عجیب چیز نہ تھی- ضمناً جب اُنھوں نے یہ اِنکشاف کیا کہ یہ مولانا خیرالدین ابو الکلام آزاد کے والد ہیں اور ان کی کتابوں کو چھپے ہوئے ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے جس کے بعد انھیں ایک طرح سے چُھپا دیا گیا، اِس پر مَیں واقعی چونک گیا اور شاہ صاحب کے ہاتھ سے کتابیں پکڑ کر حیرت سے اُن کے صفحات تکنے لگا اور خیال ہی خیال میں اُن کی اِشاعت کو ممکن بنانے کے منصوبے بھی تیار کرنے لگ گیا- اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ مَیں تو خیالی پلاؤ پکا رہا ہوں- کیوں کہ ابھی تک تو میری پہلی کتاب بھی پوری طرح سے چھپنے نہیں پائی اور مَیں زیرِ بار آ گیا ہوں، تو یہ ہزار سے زائد صفحات کا دفتر چھاپنے پر کیوں کر قادر ہو سکوں گا؟ دفعتۂ چند لمحوں کے لیے مجھے شدید حسرت بھی ہوئی اور مَیں نے اپنے آپ سے نیز شاہ صاحب سے فوری اِشاعت پر معذرت کر لی، لیکن ساتھ ہی دل میں تہیہ بھی کیا کہ جس وقت قدرت کے خزانے سے

مجھ پر اسباب فراواں ہوئے اِس خزینہ علم وادب کو اپنے اِدارے سے ضرور طبع کراؤں گا-

یہ سنہ ۲۰۰۸ء کی بات ہے، جب کہ مولانا خیرالدین دہلوی کی وفات ۱۹۰۸ء میں ہے- میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ یہ فقط اِتفاق نہیں ہے، بلکہ حضرت خیرالدین کی وفات کے پورے ۱۰۰/سال بعد آپ کے صد سالہ عرسِ مبارک کا قدرتی انتظام تھا جو اگر چہ پانچ سال بعد تکمیل کو پہنچ رہا ہے، مگر اِس کی بنا پانچ سال پہلے رکھی جا چکی تھی-

ایک اور خداوندی اِنصرام دیکھیے! اب جب کہ یہ رسائل چھپ چکے اور ملک کے طول وعرض میں پھیل گئے تو یہ بھی آپ کے عرس مبارک ہی کا مہینہ تھا جو آپ کی شخصیت وتعلیمات کو آئندہ کئی دہائیوں تک اُجاگر رکھنے کی روشن سبیل ہے- پروفیسر سیّد شفقت رضوی نے لکھا ہے:

> ''اُن (مولانا خیرالدین) کے مرید ہر سال ۱۷/رجب کو ان کا عرس کیا کرتے تھے، ۱۹۶۴ء کے بعد بہ وجوہ یہ سلسلہ باقی نہ رہا-''
>
> (ایک علمی خاندان، ص ۲۴، اِدارہ تحقیقات افکار وتحریکاتِ ملی پاکستان، ۱۹۹۰ء)

آج مولانا کی روح وجد کرتی ہوگی کہ ۵۰/سالوں سے جو سلسلۂ خیر ان کی یادوں کا موقوف تھا آج وہ پھر سے جاری ہوا چاہتا ہے اور جس احسن صورت میں ہوا اُس سے بہتر دوسری کوئی نہیں ہے- اللہ کرے یہ سلسلہ سال بہ سال جاری رہے-

نذرِ مولانا خیرالدین؛ ایک نیا کام:

اِرادہ تھا کہ مولانا خیرالدین خیوری کے رسائل کے ساتھ ان کے حالات وخدمات اور نظریات پر تفصیلی مضامین پیش کیے جائیں، مگر ایک تو ان تمام موضوعات کے اِحاطہ کے لیے وقت کی قلت تھی، دوسرا جوں جوں وقت گزر رہا تھا حضرت خیوری کی شخصیت کے نت نئے پہلو سامنے آتے جارہے تھے اور دل چاہتا تھا کہ ہر ایک جہت پر وقیع مواد جمع کر دیا جائے- محترم راجا رشید محمود (لاہور) کا قریباً ۷۰/صفحات پر پھیلا ہوا مضمون تو پہلے سے موجود تھا، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری (کراچی) نے A4 سائز کے ۳۲/صفحات لکھ بھیجے، راقم کے دو مضامین لگ بھگ ۵۰/صفحات مکمل ہونے کو ہیں- یوں کم وبیش ۲۰۰/صفحات کا مواد تو جمع ہو چکا تھا- خیال ہوا کہ عدیم الفرصتی کے باعث حاضر مواد کو ان رسائل کے ساتھ ضم کر کے چھاپ دیا جائے تو معاً احساس ہوا کہ اِس سے گو بعض پہلو کافی نمایاں ہو جاتے، مگر بعض کسی قدر تشنہ اور بعض بالکل ہی پوش رہ جائیں گے، جو جامعیت کے منافی ہے- لہٰذا فیصلہ یہ قرار پایا کہ سر دست مولانا خیرالدین کے مجرد رسائل مع مختصر حالات شائع کر دیے جائیں، تاکہ کتاب بھی بوجھل نہ ہو اور اجرا کے بعد ملک و بیرونِ ملک اہلِ علم وتحقیق تک بھجوا دیے جائیں اور انھیں دعوتِ تحریر دی جائے، یوں فرصت کے لمحات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کم وقت میں خاصا مواد جمع ہو جانے کی اُمید ہے- پھر جب کسی شخصیت کے مآثرِ علمی سامنے ہوں تب ان پر کچھ لکھنا زیادہ آسان اور لائق اِطمینان ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ تنہا سوانحی مآخذ پر قناعت کی جائے- حضرت میر حسان الحیدری سہروردی (گھوٹکی) نے از خود لکھنے کا عندیہ ظاہر کیا ہے- جناب محمد عالم مختارِ حق (لاہور)، مولانا یٰسین اختر مصباحی (دہلی)، مولانا خوشتر نورانی (دہلی)، ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم (دہلی)، ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی (علی گڑھ)، ڈاکٹر محمد اسحٰق قریشی (فیصل آباد)، پروفیسر افضل حق قرشی (لاہور) اور پروفیسر امجد علی شاکر (لاہور) بھی اِس موضوع کے لیے انسب ہیں- اللہ تبارک وتعالیٰ کی اِعانت وتوفیق سے جب کافی مواد جمع ہو جائے گا تو اسے یک جا شائع کر دیا جائے گا- اس طرح مولانا خیوری کی شخصیت کا ہمہ جہتی تعارف کرانے اور آپ کی ذات عالی صفات کو نذر پیش کرنے کا بھرپور موقع مل جائے گا-

مولانا منوّرالدین دہلوی کے رسائل کی تلاش:

آج تک ہمارے لوگوں کے لیے مولانا خیرالدین کی کتب ایک افسانہ تھیں- ان تک رسائی ممکن ہوتی تو اس کے بعد ان کے نانا مولانا منورالدین کی جانب توجہ مبذول ہو پاتی- مزے کی بات یہ ہے کہ مولانا خیرالدین کے نظریات کلہم اپنے نانا کی فکر کا پرتو تھے اور ان کے طریق سے ذرا بھی مختلف یا منحرف نہ تھے- آزاد کہتے ہیں:

> ''والد مرحوم اپنے وعظ وغیرہ تمام اُمور میں اپنے نانا کے مسلک پر ہمیشہ چلتے تھے-''
>
> (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص: ۱۲۴)

مطلب یہ ہوا کہ مولانا خیرالدین کی تصانیف میں وہابیہ کے ردِ اشد میں جو مضامین پائے جاتے ہیں اور سنیت کی حمایت کا جو رنگ جس ڈھنگ میں پایا جاتا ہے حضرت مولانا منورالدین دہلوی کی کتب میں

یہ عناصر انتہائی درجہ میں ملیں گے- لہٰذا دارُالاسلام کی طرف سے کوشش جاری ہے کہ حضرت کی تصانیف کو بھی بازیاب کرایا جائے اور اس مجموعہ کی طرح انھیں بھی طبع کیا جائے-

انڈین محققین سے گزارش:

نیشنل لائبریری، کلکتہ (انڈیا) میں حضرت خیرالدین کے کچھ مخطوطات کی خبر ملی ہے، اگر یہ سچ ہے تو لازماً وہاں مطبوعہ رسائل بھی ہوں گے، مگر وہ کتنے ہیں اور کون کون سے ہیں اور ان کی کیفیت کیا ہے؟ اب تک کوئی سراغ نہیں لگایا جا سکا ہے- انڈیا کے علم دوست اور اہل تحقیق حضرات سے گزارش ہے کہ وہ ان تک رسائی میں ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں، تاکہ انھیں بھی منظر عام پر لایا جا سکے- کیوں کہ پاکستان میں رہ کر انڈیا کے دور دراز علاقے سے بغیر کسی ربط ضبط اور اِعانت کے ایسے نوادر حاصل کرنا ناممکن ہے، خاص طور پر مجھ سے ناتواں کے لیے-

نوٹ: جو حضرات مولانا خیرالدین دہلوی یا مولانا منورالدین رحمۃ اللہ علیہما سے دل چسپی رکھتے ہوں یا ان پر کام کرنا چاہتے ہوں، وہ ہم سے رجوع فرمائیں، اِن شاء اللہ الملک القدوس مواد کی کھوج، محققین سے ربط، کارِ تحقیق میں راہ نمائی اور طباعتی وسائل کی فراہمی میں اُن سے ہر قسم کا ممکن تعاون کیا جائے گا-□□□

حواشی

۱-مولانا منورالدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت تیرھویں صدی ہجری کے اِبتدائی سالوں میں ہوئی- آپ کے والد قاضی سراج الدین شہید رحمۃ اللہ علیہ احمد شاہ ابدالی کے عہد میں لاہور کے قاضی القضاۃ اور پنجاب کے افغان نائب السلطنت کے مشیر تھے- والدین کی طرف سے سلسلۂ نسب شیخ جمال الدین معروف بہ ''بہلول دہلوی'' پر منتہی ہوتا ہے جو حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما کے معاصر تھے-

اِبتدائی تعلیم علمائے لاہور سے حاصل کی، پھر دہلی حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا قصد کیا اور ان کے حلقہ درس میں شریک ہوئے- وہاں آپ کے ہم درس مولانا رشیدالدین خان دہلوی، مولانا برہان الدین، مولوی اسماعیل دہلوی، شاہ احمد سعید مجددی اور مولانا محمد وجیہ وغیرہ تھے اور یہ جماعت حضرت شاہ صاحب کے اوّلین تلامذہ کی تھی- تکمیل کے بعد خود اپنا حلقہ درس قائم کیا- آپ کے شاگردوں میں مشاہیر مولانا سدیدالدین (مدرّسِ اوّل مدرسہ عالیہ، کلکتہ)، مولوی محبوب علی دہلوی، مولانا فضل اِمام خیرآبادی، مولانا محمد علی گوپاموی ہیں-

سکھ راجا رنجیت سنگھ نے جب ملتان پر حملہ کیا تو اُس دوران محاصرے میں مولانا منورالدین کے والد کی شہادت ہوگئی، پھر آپ نے پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی- یہاں آپ کے درس وتدریس کا شہرہ بامِ عروج کو پہنچا تو سلطنتِ مغلیہ کے رُکن المدرّسین (وزیرِ تعلیم) کا عہدہ انھیں تفویض کیا گیا-

تصانیف میں جواب رسالہ حسینیہ از شیعہ مصنف، شرح مشارق الانوار (عربی)، حاشیہ مطول، سیرۃ النبی (فارسی) نیز مَا اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ اور شدِّ رحال پر ایک ایک اور شاہ اسماعیل دہلوی کے رد میں کئی رسالے تصنیف فرمائے- آپ کی کتابوں پر بہادر شاہ ظفر اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ نیز دیگر بارسوخ علما کی تقاریظ موجود ہیں-

تاریخی مباحثہ جامع مسجد دہلی کا حال بھی قلم بند کیا- مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا ہے:

''مولانا محمد اسماعیل شہید مولانا منورالدین کے ہم درس تھے- شاہ عبدالعزیز کے اِنتقال کے بعد جب اُنھوں نے 'تقویۃ الایمان' اور 'جلاء العینین' لکھی اور اُن کے مسلک کا ملک میں چرچا ہوا تو تمام علما میں ہل چل پڑ گئی- اُن کے رد میں سب سے زیادہ سرگرمی بلکہ سربراہی مولانا منورالدین نے دکھائی- متعدد کتابیں لکھیں اور ۱۸۴۰ھ والا مشہور مباحثہ جامع مسجد کیا- تمام علمائے ہند سے فتویٰ مرتب کرایا، پھر حرمین سے فتویٰ منگایا- ان کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اِبتدا میں مولانا اسماعیل اور اُن کے رفیق اور شاہ صاحب کے داماد مولانا عبدالحی کو بہت کچھ فہمائش کی اور ہر طرح سمجھایا، لیکن جب ناکامی ہوئی تو بحث ورَد میں سرگرم ہوئے اور جامع مسجد کا شہرۂ آفاق مناظرہ ترتیب دیا جس میں ایک طرف مولانا محمد اسماعیل اور مولانا عبدالحی تھے اور دوسری طرف مولانا منورالدین اور تمام علمائے دہلی-''

(آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی بہ روایت ملیح آبادی، ص۴۴-۴۵، مکتبہ اِشاعت القرآن، دہلی ۱۹۶۵ء)

سن ستاون کی جنگِ آزادی کے ایک یا دو سال بعد (۱۲۷۵-۷۶ھ/ ۱۸۵۸-۵۹ء) آپ کا اِنتقال ہوگیا-

مولانا منورالدین نے اپنی بیٹی شیخ محمد ہادی ابن شیخ محمد احسن سے منسوب کی جن سے مولانا خیرالدین دہلوی کی ولادت ہوئی-

☆مؤسس ''دارُالاسلام''- مدیر مجلّہ ''حجۃ الاسلام''، لاہور (پاکستان)
darulislam21@yahoo.com

اظہارِ خیالات

اس کالم میں آپ سیاسی، سماجی، ادبی، مذہبی اور ملی کسی بھی مسئلہ پر اپنی فکر اور اپنے خیال کا برملا اظہار اور بے لاگ تبصرہ کر سکتے ہیں جو ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا جائے گا، واضح ہو کہ اس سلسلے میں آپ کی تحریر مختصر اور جامع ہونی چاہیے.......................(ادارہ)

انہوں نے زندگی کمائی ہے

مولانا کوکب نورانی اوکاڑوی

چیئرمین: اوکاڑوی اکیڈمی، سولجر بازار، کراچی (پاکستان)

محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ............ محترم پیرزادہ علامہ اقبال احمد فاروقی جمعرات ۱۹ر دسمبر ۲۰۱۳ء اس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے- انا للہ وانا الیہ راجعون- اللہ کریم جل شان ان کی مغفرت فرمائے- ۴ر جنوری ۱۹۲۸ کو ضلع گجرات کے ایک گاؤں میں ان کی ولادت ہوئی، حضرت مولانا نبی بخش حلوائی نقش بندی کے شاگردِ رشید تھے، ایم اے فارسی پنجاب یونی ورسٹی سے کیا، فوج اور سول اداروں میں ملازمت بھی کی، ڈپٹی ڈائریکٹر لیبر ویلفیئر آف پنجاب کے منصب سے ۱۹۸۸ء میں ریٹائر ہوئے، عربی، فارسی، اردو اور پنجابی میں کمال دست رس رکھتے تھے، باکمال خطیب اور ادیب تھے، جمعیۃ العلما پاکستان کے فعال رکن رہے، مرکزی مجلسِ رضا، لاہور کے سربراہ اور ماہنامہ ''جہانِ رضا'' کے مدیر اعلی تھے- لاہور میں مکتبہ نبویہ کی ۱۹۶۸ء میں بنیاد رکھی، تفسیر نبوی (پنجابی) کا اردو ترجمہ، تذکرِ علمائے اہل سنت، ترجمہ الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین، ترجمہ نزھۃ الخواطر، ترجمہ تکمیل الایمان، ترجمہ مرج البحرین، ترجمہ زبدۃ الآثار، ترجمہ مقامات صوفیہ، ترجمہ قصر عرفان، ترجمہ خزینۃ الاصفیا، ترجمہ و تلخیص الدولۃ المکیۃ، خلاصہ کشف المحجوب، مجالس علما، فکر فاروقی، نسیم بطحا، باتوں سے خوش بو آئے جیسی کتابیں یادگار بنائیں- اعلی حضرت مجدد بریلوی علیہ الرحمہ کے حوالے سے ان کی خدمات کی ایک تفصیل ہے- مجھ گناہ گار سے بہت محبت رکھتے تھے اور بہت قدر دانی فرماتے تھے- گزشتہ کچھ عرصے سے علیل تھے، میرے چچا محترم کے وصال پر تعزیت کے لیے فون کیا اور وہی ان سے میری آخری گفتگو ثابت ہوئی- ۱۹ر دسمبر کی شب ۱۱:۴۷ پر ان کے فرزند نے ان کے وصال کی خبر سنائی، سماعت پر شبہ گزرا، مگر مرضی مولا از ہمہ اولیٰ- گزشتہ پیر کے دن بھارت کے شہر جے پور میں محترم راشد برکاتی، اجمیر شریف جاتے ہوئے کار ایکسی ڈینٹ میں شہید ہو گئے، بہت پیارے دوست اور عقیدت مند تھے، کیسے کیسے پیاروں سے محروم ہوتا جا رہا ہوں- صدموں کا یہ تسلسل مجھ ناتواں کو نڈھال کر رہا ہے، اللہ کریم جل شانہ اپنے حبیبِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے ایمان کی سلامتی کے ساتھ مجھے نیکی پر استقامت عطا فرمائے، آمین-

کچھ عرصے قبل حضرت فاروقی صاحب اور ان کی کتابوں پر دو مختصر تاثراتی تحریریں لکھی تھیں، انھیں یہاں شامل کر رہا ہوں، ان کے ذریعے ان کی باغ و بہار شخصیت سے آپ کے قارئین متعارف ہوں گے-

''خون'' بولتا ہے- خون اپنی اصل بتا تا ہے- یہ جملہ کہے سنے جاتے ہیں- کبھی ان کا جلوہ بھی ہوتا ہے- حضرت پیرزادہ اقبال احمد صاحب ''فاروقی'' ہیں اور ان کی گفتگو اور تحریر میں اس نسبت کی جھلک ان کے سامعین و قارئین نے ضرور دیکھی ہوگی- آواز کا زیر و بم، لفظوں کا تلاطم اور لہجے کا دم خم بتا تا ہے کہ کوئی جو ہر قابل، مقابل ہے- وہ نشتر ہیں تو مرہم بھی ہیں- بہر رنگ وہ ایک ''قد آور'' شخصیت ہیں- وہ بولنے پر آئیں تو اپنی بات سنانے اور لکھیں تو اپنا لکھا پڑھانے کا ہنر خوب جانتے ہیں- وہ جھرمٹ سجاتے اور نگینے چمکاتے ہیں- باخبر رہنا ان کی طبیعت اور باخبر رکھنا ان کی عادت ہے- وہ بھولتے نہیں، ہاں کبھی بھولے بن جاتے ہیں- ان کا یہ انداز ان کی باتوں کی دھمک میں اضافہ کرتا ہے- پیرزادہ اقبال احمد فاروقی کو سنیے یا پڑھیے وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے- ایک عہد، ایک تاریخ ان کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے- وہ یادیں بکھیرتے ہیں تو جہان سمیٹ دیتے ہیں- ان کا

تعارف ایک جملے میں (میرے نزدیک) یہی ہے کہ ''انہوں نے زندگی کمائی ہے۔'' اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ماہنامہ ''جہان رضا'' (لاہور) سے سمتوں میں فاروقی صاحب اثر انداز ہوئے ہیں۔ اس مجلّے کی اشاعت سے قبل وہ اپنے علمی ذوق کی تسکین میں مشغول تھے۔ انہیں کتابوں کے تراجم اور تحقیق کے کٹھن مراحل سے شغف تھا۔ ہاں! اس عرصے میں بھی وہ قلوب واذہان کو جگانے اور جھنجوڑنے سے غافل نہیں رہے۔ علامہ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی جیتے جاگتے رہنے ہی میں یقین رکھتے ہیں، ان کی تحریریں ''باتوں سے خوشبو آئے'' پڑھیے، آپ ان سے اختلاف کا حق محفوظ رکھیے مگر محظوظ ہونا فراموش نہ کیجیے۔ ان شاء اللہ یہ آوازیں اور اس شخص کے قلم کی گونج آپ کے دل کو لبھائے گی۔

حضرت پیرزادہ علامہ اقبال احمد فاروقی کا نام تو سنا ہوا تھا، مگر ان سے میری ملاقات ربع صدی قبل ہوئی۔ وہ ایک علم دوست انسان ہیں اور اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ بات تحریر کی ہو یا تقریر کی، وہ اپنا الگ لہجہ اور انداز رکھتے ہیں۔ انہیں جتنا شغف کتابوں سے ہے، اس سے کہیں زیادہ اہل علم سے ہے۔ میں انہیں محبتوں اور رابطوں کا آدمی کہتا ہوں۔ وہ گل دستہ بنانا اور سجانا ہی نہیں اسے مہکانا بھی جانتے ہیں۔ آواز میں طنطنہ ہے تو شخصیت میں دبدبہ ہے۔ جس لہجے میں بولتے ہیں اسی میں لکھتے ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ پیرزادے ہی نہیں، صاحب علم بھی ہیں، یعنی زبان و بیان سے خوب آگاہ ہیں۔ عربی ہو یا فارسی، انگریزی ہو یا اُردو، وہ ان زبانوں کے شناور ہیں اور اپنے پنجابی خاص مزاج کے مطابق ان زبانوں کے الفاظ برتنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ بناوٹ کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ مجھے شبہ ہے کہ انہیں تکلف سے کبھی علاقہ رہا ہوگا۔ بے ساختگی میں شگفتگی ان کی بولی میں بھی ہے اور تحریر میں بھی۔

جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

''مکہ مکرمہ میں ایک دن ہمارے ''متعارفی دوست'' ایک ایسے بزرگ کو لے آئے جو فلسطین سے آئے تھے۔ خدا معلوم انہیں ہمارے متعلق کیا کیا کہا گیا کہ بذات خود وہ بزرگ سبز عمامہ پہنے اور سبز لباس میں خراماں خراماں جلوہ فرما ہوگئے۔ ہم احترام کو اٹھے، استقبال کیا، دست بوسی کی اور نہایت عجز وانکساری سے ان کی آمد کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بیٹھ گئے۔ آب زم زم کی سفید گلاسی پیش کی تو خوش ہوگئے۔ عطر کی ایک شیشی ہدیہ کی تو ان کی آنکھیں جذبات تشکر سے چمک اٹھیں۔ وہ فلسطین کے اس علاقے سے آئے تھے جو بیت المقدس کے مضافات میں ہے اور ابھی تک یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ میں ان سے عربی میں باتیں کرتا رہا۔ ان کا شکریہ ادا کرتا رہا، ان کی آمد پر اظہار مسرت کرتا رہا۔ مگر انہیں محسوس ہوا کہ میری عربی ختم ہو رہی ہے اور میں بات کرتے کرتے رکنے لگا ہوں، وہ مسکرائے اور کھل کر اُردو میں باتیں کرنے لگے تو میرا بوجھ ہلکا ہوگیا۔''

لکھتے ہیں: ''میں نے ''ریاض الجنۃ'' میں ایک دیو قامت حبشی کو پھیلے ہوئے دیکھا۔ میرا دل چاہا کہ اس کے پہلو میں بیٹھ کر درود وسلام پڑھوں، مگر وہ کسی کو اپنے نزدیک نہیں آنے دیتا تھا۔ سیاہ کالا، دیو ہیکل جسم، پہلوانوں کا پہلوان، مگر دل روشن، دراز قد، مگر گردن خمیدہ، ڈراؤنی صورت، مگر دل میں عشق مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شمع فروزاں، مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بلال یاد آگیا، دل میں کہا کہ حبش سے آیا ہے، ''بلالی'' ہے۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آج میں آپ کے بلال کے پہلو میں بیٹھنا چاہتا ہوں، مگر یہ کالا پہاڑ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا تھا، فوراً میری درخواست قبول ہوئی، اس حبشی نے پہلو بدلا، مجھے اپنے ساتھ لگالیا، جگہ دی، بٹھالیا۔ میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اس نے دیکھا تو میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ کندھوں پر تھپکی دی، تسلی دی اور اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ وہ محبت کا پہاڑ تھا۔ وہ شفقت کا دریا تھا، وہ عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا امین تھا...... مجھے خیال آیا کہ میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی حکمرانیاں کالے گوروں دلوں دلوں پر یکساں ہیں۔ دنیا کے ویرانوں میں شمع شبستان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جگ مگا رہی ہے۔ ہر دل میں عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ تمام دل روشن ہو رہے ہیں اور آنکھیں اشک بار کر رہی ہیں۔''

عقیدت کا بیان کرتے ہوئے خوش عقیدگی دیکھئے: ''میں آگے بڑھا، ''ریاض الجنۃ'' پیچھے رہ گئی تھی اور میں ''قاسم الجنۃ'' کے سامنے کھڑا تھا۔''

کیفیت کی ترجمانی کتنی آسانی سے کرتے ہیں، ملاحظہ ہو: ''میں ہجوم عاشقان رسول کے ساتھ چلتا ہوا، باب جبریل سے باہر نکلا تو حضرت ابو ایوب انصاری کے گھر کی دیوار کا سہارا لیتے ہوئے ''قدمین شریفین'' پر جا کھڑا ہوا۔ سر جھکا کر خوب رویا، روتا رہا روتا رہا، بے خود ہو کے......ع

سارے جہاں کو بھول گیا تیری یاد میں

ہوش آیا تو ''باب النساء'' سے گزر کر اصحاب صفہ کے مدرسے میں جا بیٹھا-قرآن پاک اٹھایا، تلاوت کی اور ہجر وفراق کے زخم مندمل ہو گئے-''

فاروقی صاحب کا قلم شوخیاں بھی کرتا ہے، ملاحظہ ہو:

''میرے ''طویل القامت''، ''طویل اللباس''، ''طویل اللحیہ''، اور ''طویل التسبیح'' ساتھی کا بھی شکریہ ادا کیا-''

ان کے بیان میں روانی اور چاشنی دیکھیے: ''میرے ساتھی سب نوجواں، میں ساٹھ سال سے اوپر کا ناتواں، مگر دل مانتا نہیں تھا کہ ''جبل نور'' کی بلندیوں پر پہنچنے کے لیے کسی نوجوان کا سہارا لوں، پتھروں پر قدم رکھتے رکھتے بلندیوں پر چڑھنا شروع کیا تو سانس پھولنے لگا، دل دھڑکنے لگا، پاؤں کانپنے لگے، انہی پتھروں پر چل کر کبھی غار حرا کا چاند گزرا تھا، میں تھک گیا- خیال آیا میں کیوں آیا؟ مگر اہل محبت کو قطار در قطار اوپر جاتے دیکھا تو حوصلہ ہوا- حال جسم وجاں کسی کو نہ بتایا، حال جان ناتواں کسی پر نہ کھولا- دوسو گز ہانپتا کانپتا چڑھتا گیا تو اپنے آقا کے شہر سے ہوا کا ایک خوش گوار جھونکا آیا- آفتاب کی چند کرنیں چہرے پر پڑیں، بدن توانا ہوگیا، تھکاوٹ دور ہوگئی، سانس درست ہوگیا، جسم میں تر وتازگی آ گئی، قدم اٹھنے لگے، پستیاں پیچھے رہنے لگیں، یوں محسوس ہونے لگا کہ ''غار حرا'' کی یہ چڑھائی ''کوچۂ محبوب'' کی سختی اور سنگلاخی نہیں، فرش مخمل بچھا ہوا ہے-''

اپنے محترم دوست فاروقی کے لیے پہلے لکھ چکا ہوں کہ انہیں سنیے یا پڑھیے، یہ کبھی تنہا نہیں ہوتے، ایک عہد، ایک تاریخ ان کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے-

ایسے درویشوں کا تاریخ میں نام آتا ہے ایسے درویشوں کی اے اہل جہاں قدر کرو

حرمین شریفین کے اسفار کی روداد (نسیم بطحا) میں آپ ہر قدم پر مقامات مقدسہ کی تاریخ کے دریچے بھی وا ہوتے دیکھیں گے- برسوں پہلے جناب مختار مسعود کی کتاب ''آواز دوست'' پڑھی تھی، ایسا ہی کچھ انداز تھا، مگر وہ ''مینار پاکستان'' کا تذکرہ تھا- یہ تذکرہ تو ''جبل نور'' کا ہے، یہ ذکر تو دل وجان کا ہے، یہ بیان تو دین وایمان کا ہے اور بیانیہ اس کا ہے جسے علم وعرفان سے وابستگی میں عمر عزیز کی آٹھ دہائیاں بتانے کی سعادت حاصل ہے-

۱۹۷۵ء میں مجھے پہلی مرتبہ دیار حبیب کریم علیہ التحیۃ والتسلیم میں حاضری کا شرف حاصل ہوا تھا- جب سے اب تک وہاں کے اسفار میں نے شمار نہیں کیے- وہاں جانا سعادت ہی سعادت ہے- اس کرۂ ارض پر حرمین شریفین ہی وہ مقام ہیں جو رشک مہر وماہ ہیں- تاحال میں نے ان اسفار کی روداد لکھنے کی ہمت نہیں کی- فاروقی صاحب نے ہر بار اپنے دل کی ترجمانی کی ہے اور خوب کی ہے-

فاروقی صاحب کا تحریری سرمایہ محفوظ ہو رہا ہے- انشائیے ہوں یا اداریے، علما کی یادیں ہوں یا ''رجال الغیب کی باتیں'' ان کو کتابی شکل دی جا رہی ہے- زیر نظر کتاب بھی ان کے خوش پاروں کا مجموعہ ہے- قارئین کو ان تحریروں میں وہ ''فاروقی'' نظر آئے گا جو دیار حبیب کا مسافر ہے اور آپ کا دل چاہے گا کہ کاش ہم بھی اس کے رفیق سفر ہوتے- فاروقی صاحب کی ان تحریروں میں ان کا قلم مشک بار ہے تو خامہ اشک بار بھی ہے- ان تحریروں میں مہک بھی ہے اور لپک بھی- پڑھیے، پڑھتے جائیے اور نسیم بطحا کے جھونکوں میں یا حرم کو کھو جائیے- فاروقی صاحب یہی کہتے نظر آئیں گے:

جیسا طیبہ کو ہم نے دیکھا ہے تم نے جانا ہے کم نے دیکھا ہے
وہ دیار نبی وہ خلد جمال ہم کو دیکھو کہ ہم نے دیکھا ہے

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

ڈاکٹر افضل مصباحی

اسسٹنٹ پروفیسر: ڈاکٹر ہری سنگھ گور سنٹرل یونیورسٹی، ساگر (ایم پی)

برادرم مولانا خوشتر نورانی صاحب! سلام مسنون......ابھی حال ہی میں میری کتاب ''اردو صحافت: آزادی کے بعد'' پر ماہ نامہ ''اردو بک ریویو'' دہلی میں معصوم مرادآبادی، ایڈیٹر روز نامہ ''جدید خبر'' اور پندرہ روزہ ''خبردار جدید'' کا تبصرہ شائع ہوا تھا، جو مسلکی تعصب کا شاہکار ہے، اس جانب دارانہ اور غیر علمی تبصرے سے ادبی اور صحافتی حلقوں میں بے چینی پھیل گئی، اس لیے میں نے ایک وضاحتی خط ''اردو بک ریویو'' کے ایڈیٹر کو لکھا تھا، جو کافی قطع وبرید کے بعد ''اردو بک ریویو'' کے تازہ شمارے میں جگہ پا سکا- چونکہ آپ کا رسالہ ''جام نور'' ادبی حلقوں میں بھی خوب پڑھا جاتا

ہے،اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کی خدمت میں یہ خط ارسال کردوں،تا کہ بلیک میلنگ کا جو جال بنا جارہا ہے،آپ کے رسالے کے توسط سے ہمارے اسکالرز باخبر ہوسکیں-اگر مناسب سمجھیں تو شائع فرما کر شکریہ کا موقع عنایت کریں- (فضل مصباحی)

مکرمی ایڈیٹر صاحب!اردو بک ریویو،دہلی......آداب

آپ نے میری کتاب ''اردو صحافت آزادی کے بعد''پر معصوم مرادآبادی ایڈیٹر روزنامہ''جدید خبر''اور پندرہ روزہ''خبردار جدید''دہلی کا تبصرہ شائع کیا-آپ کا شکریہ کہ آپ نے صحافت کے ایک طالب علم کی انتہائی ناقص کتاب پر''معرکہ آرا''اخبارات کے ایڈیٹر صاحب کا تبصرہ شائع کیا-قارئین حیران ہوں گے کہ میری کتاب پر اظہار خیال فرمانے کے لیے مدیر محترم نے اپنے''کثیرالاشاعت''اخبارات کا سہارا نہ لے کر آپ کے رسالہ کا سہارا کیوں لیا؟

بہر حال یہ ان کی ذاتی پسند ہے،مبصر تبصرے میں ابتدا تا انتہا بے حد چراغ پا اور آپے سے باہر نظر آرہے ہیں-اس کی وجوہات پر جب میں نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ میری اس کتاب میں نام نہاد اخبارات''جدید خبر''اور''خبردار جدید''اور مبصر کی گم نام کتاب''اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857''کا ذکر موجود نہیں ہے-اول الذکر دونوں اخبارات کا تذکرہ میں نے قصداً اس لیے نہیں کیا کہ اس طرح کی فائل کاپی والے سیکڑوں ہزاروں اخبارات صرف ارباب اقتدار کی خوشامد کے لیے شائع کیے جاتے رہے ہیں،حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا،اسی لیے ان اخبارات کے ایڈیٹر حضرات بھی اپنی بات کہنے کے لیے دوسرے ذرائع ابلاغ کا سہارا لیتے ہیں-جہاں تک سوال ہے مذکورہ کتاب کا تذکرہ نہ کرنے کا،تو اس سلسلے میں سچائی یہ ہے کہ آپ کے نام خط لکھنے تک مذکورہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری ہے-ظاہر ہے ایسی صورت میں اس سے مواد اور حوالوں کے اٹھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا-اگر اس کتاب کا ایک جملہ بھی میری کتاب میں موجود ہوتا تو مبصر دلیل کے طور پر اسے ضرور پیش کرتے-مبصر میری ڈاکٹریٹ کی ڈگری اور کتاب کی اشاعت سے بے حد نالاں نظر آتے ہیں-اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے،یہ مجھے نہیں معلوم،البتہ اس سے حسد،جلن اور تعصب کا پہلو ضرور واضح ہوتا ہے-مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ مبصر کے عتاب کا شکار وہ دو شخصیات (پروفیسر وہاب اشرفی اور سید محمد اشرف مارہروی) بھی ہو گئیں جن کی آرا میں نے اپنی کتاب میں شامل کی ہیں-

مبصر لکھتے ہیں:''ان کا صحافت کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے......''

پروفیسر وہاب اشرفی صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے،ورنہ وہ اس کا جواب ضرور دیتے کہ ان کا تعلق صحافت کے موضوع سے رہا ہے یا نہیں،البتہ اردو دنیا اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ مرحوم اپنے دور طالب علمی میں''صنم''نام کا رسالہ نکالتے تھے اور تاحین حیات وہ''محاسبہ''کے نام سے رسالہ نکالتے رہے،جسے ادب اور صحافت کا شاہکار ہونے کا شرف حاصل ہے-مجھے یقین کامل ہے کہ مرحوم کی ادبی اور صحافتی خدمات پر نظر رکھنے والے اسکالرز اس کا جواب ضرور لکھیں گے-جہاں تک تعلق ہے سید محمد اشرف صاحب کا،تو ان کی صلاحیتوں سے اردو کا ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم بھی واقف ہے-ایسا غیر ممکن ہے کہ اردو ادب کی کسی غیر معمولی شخصیت کا''صحافت کے موضوع سے کوئی تعلق نہ ہو''-میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سید محمد اشرف صاحب ہم جیسے صحافت کے طالب علموں کو ادب اور صحافت دونوں موضوعات کا درس دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں-ان شخصیات کو صحافت کے موضوع سے نابلد کہنا آسمان پر تھوکنے کے مترادف ہے-تاریخ شاہد ہے کہ اردو کے بیشتر بڑے صحافیوں کا ادب میں بھی بڑا نام رہا ہے-مولانا حسرت موہانی،مولانا ابوالکلام آزاد،خواجہ حسن نظامی اور حیات اللہ انصاری وغیرہ سیکڑوں شخصیات کا اس ضمن میں نام لیا جاسکتا ہے-ہاں!یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ''کاسہ لیس''صحافت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے-

جناب گربچن چندن سے رسائی حاصل نہ کرنے پر مبصر صاحب کی ناراضگی بجا ہے-یقینی طور پر گربچن صاحب کو اردو صحافت کا انسائیکلو پیڈیا کہا جاسکتا ہے،جیسا کہ موصوف نے بھی لکھا ہے-اسی لیے میں نے ان کی تین کتابوں سے اپنے تحقیقی کام کو تقویت بخشی ہے-کسی بھی قلم کار سے رسائی کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہوسکتا ہے؟

تبصرہ نگار لکھتے ہیں:''اگر یہ کتاب اشاعت سے پہلے کسی تجربہ کار اور ذی علم صحافی کی نظر سے گزرتی تو ایک کارآمد کتاب بن سکتی تھی......''

چلئے مشروط طور پر ہی سہی کارآمد ہونے کا اعتراف تو کیا- ہاں! 'تجربہ کار' اور 'ذی علم صحافی' سے ان کی مراد خود سے ہے، تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اشاعت سے قبل میری یہ کتاب نظر بد سے محفوظ رہی، ورنہ یہ میرے نام سے کبھی منظر عام پر نہیں آپاتی- چند ماہ کے اندر میری کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور تیسرے ایڈیشن کی تیاری زوروں پر ہے- اس دوران نہ جانے کتنے ادیبوں، صحافیوں اور مایہ ناز شخصیتوں کی نظروں سے یہ کتاب گزر چکی ہوگی، متعدد ادبی رسالوں اور اخبارات میں غیر جانب دار تبصرے بھی شائع ہو چکے ہیں، لیکن کسی نے اب تک یہ نہیں لکھا کہ اس میں صرف خامیاں ہی خامیاں ہیں، جیسا کہ آپ کے رسالے میں شائع تبصرہ میں بتانے کی کوشش کی گئی ہے- مجھے یہ تسلیم ہے کہ میری اس کتاب میں کچھ کمیاں ہیں، جو وقت کے ساتھ ساتھ دور ہوتی رہیں گی، لیکن صرف خامیاں ہی خامیاں ہیں، یہ بات صرف وہی کہہ سکتے ہیں، جن کی زبان حق بات کہنے سے قاصر ہو، جن کا قلم حق بات لکھنے سے عاری ہو اور جن کی آنکھ حقائق دیکھنے سے معذور ہو- اسی لیے مبصر موصوف کی متعصب نگاہ باب سوم میں مولانا آزاد سے آگے دیکھنے سے قاصر رہی، جب کہ اس باب میں راجہ رام موہن رائے سے لے کر شفیع محمود ایوبی تک ۳۴ راہم صحافیوں کا تفصیلی اور سیکڑوں صحافیوں کا اجمالی ذکر موجود ہے- مولانا آزاد کے تعارف میں انداز بیان پر مبصر کا اعتراض مجھے تسلیم ہے- سہواً ایسا ہو گیا ہے، قصد کا کوئی دخل نہیں ہے- تیسرے ایڈیشن میں اس خامی کے دور کرنے کا قارئین کو یقین دلاتا ہوں- جن اخبارات کے تذکرے میری کتاب میں نہیں شامل ہیں، ان کی طرف مبصر نے ''باب چہارم کو سب سے ناقص'' قرار دیتے ہوئے اشارہ کیا ہے، ان کے احاطے کی گنجائش اس کتاب کی دوسری جلد میں ہی ممکن ہے، جس کا اعتراف میں نے اپنی کتاب میں کئی جگہوں پر کیا ہے- شاید مبصر کی نگاہ اس پر نہیں پڑ سکی، ورنہ وہ ایسا نہیں لکھتے- اس باب میں ملک کے طول و عرض سے شائع ہونے والے تقریباً ۵۰ راخبارات کا تفصیلی اور سیکڑوں اخبارات کا اجمالی ذکر موجود ہے- مبصر موصوف کی دیانت داری دیکھئے کہ جن اخبارات کا ذکر میری کتاب میں موجود نہیں ان کا تذکرہ تبصرے میں موجود ہے، اور جن کا احاطہ کتاب میں کیا گیا ہے، ان کا ذکر تبصرے میں ندارد ہے- مبصر کو پریشانی اس بات کی بھی ہے کہ میں نے بہار کے گیارہ اخبارات کا ذکر کیوں کیا؟ ظاہر ہے اس کا مقصد علاقائی عصبیت کو فروغ دینے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ جو مبصر کا ہمیشہ سے وطیرہ رہا ہے- فہرست دیکھ کر تبصرہ کرنے اور کوئی رائے قائم کرنے سے قبل کتاب کے مطالعے کی زحمت کرتے تو شاید وہ یہ الزام عاید کرنے سے گریز کرتے کہ میں نے اتر پردیش اور بہار کے اخبارات کے ذکر میں تعصب سے کام لیا ہے- اگر مبصر کتاب کی فہرست کو ہی عصبیت کا عینک اتار کر دیکھ لیتے تو یہ نہیں لکھتے: ''اس کتاب میں اتر پردیش کے اردو اخبارات (صفحہ: ۲۹۱ ر ۲۹۳) کا تذکرہ محض تین صفحات پر کیا گیا ہے......''

اس لیے کہ صفحہ: ۲۹۱-۲۹۳ کی بجائے ۲۹۴-۲۹۱ پر اس کا ذکر کیا گیا ہے- ایک صفحہ تو مبصر یوں ہی ڈکار گئے- اس کے علاوہ میں نے الگ الگ مقامات پر اتر پردیش کے درجنوں اخبارات کا ذکر کیا ہے، وہ الگ- ساتھ ہی ''قومی آواز'' اور ''عزائم'' کے علاوہ راشٹریہ سہارا لکھنؤ کا بھی ذکر صفحہ ۳۴۵-۳۵۰ پر موجود ہے- اس کے باوجود تعصب کا الزام عاید کیا گیا ہے، جو کتنا درست ہے، وہ قارئین ہی فیصلہ کریں گے- دہلی کے ضمن میں مبصر نے لکھا ہے کہ: ''دہلی کے معروف اخبار 'تیج'' کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے''

حالاں کہ کتاب کے صفحہ ۳۲۴-۳۲۶ پر ''تیج'' کا ذکر موجود ہے- اگر دیدۂ کور کو دن کے اجالے میں بھی نظر نہ آئے تو آفتاب کے ٹکیے کا کیا قصور؟ ''فیصل جدید'' کے ذکر خیر سے مبصر کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہے ہیں- اس سلسلے میں جب میں نے حقائق جاننے کی کوشش کی اور ''فیصل جدید'' سے منسلک صحافیوں سے رابطہ کیا تو پتہ چلا کہ اخبار کے ایڈیٹر صاحب نے مبصر کو کتابت کی ملازمت دینے سے منع کر دیا تھا، جس کے بعد وہ ''نئی دنیا'' میں کتابت کرنے لگے- کمپیوٹر کی ایجاد نے جب کاتبوں کو سڑک پر لا کھڑا کیا تو جو خود دار کاتب تھے، وہ کمپیوٹر سیکھ کر اخبارات سے جڑے رہے اور کچھ نے دوسرا پیشہ اختیار کر لیا- مبصر نے ایسا نہ کر کے فائل کاپی والے ایک نہیں دو دو اخبارات کا رجسٹریشن کرالیا، تاکہ سرکاری مراعات زیادہ سے زیادہ مل سکیں اور روزی روٹی چلتی رہے- اگر مبصر یہ راستہ اختیار نہ کر کے جامعات کا رخ کرتے اور ایم فل، پی ایچ ڈی یا صحافت کا کوئی کورس کر لیتے تو شاید انہیں بڑے اخبارات میں باوقار عہدے پر کام کرنے کا موقع مل جاتا- اس طرح وہ زبردستی صحافی کہلوانے کی بجائے تسلیم شدہ صحافی اور پڑھے لکھے انسان کہلاتے اور نئی نسل کی ''ناقص'' کوششوں کو بھی سراہنے کا جذبہ رکھتے، **بقیہ صفحہ 41 پر ملاحظہ کریں**

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی☆

اَلقُران علیٰ فُعَال؟

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی سے منسوب ایک غور طلب جملہ

برسوں پہلے، اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قصیدۂ نونیہ ''مدائح فضل الرسول'' پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا اور درج مصرع میری توجہ کا مرکز بن گیا تھا:

او علم تاویل القران فیاله

یہ قصیدہ بحر کامل میں ہے، جس کی ضرب مقطوع ہے، کہیں کہیں عروض میں بھی زحاف قطع واقع ہے، یہ سب جائز ہے- جہاں پر میری نظر ٹھہر گئی تھی وہ تھا لفظ ''قرآن''، جس کا عروضی وزن ''پکار'' ہے، ہماری زبانوں پر رائج لفظ قرآن بروزن ''فرقان'' سے مصرع وزن شعری سے ساقط ہو جاتا ہے- قرآن کو ''قران'' پڑھنے سننے سے ہمارے کان آشنا نہیں تھے، مصحف شریف میں بھی ہر جگہ قرآن ''فعلان'' کے وزن پر ہی دیکھا گیا ہے، مگر یہ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کا قصیدہ ہے جن کی ادبی ولسانی حیثیت مسلم ہے، اس لیے اس کا تو گمان نہیں ہوا کہ مصنف سے سہو ہوا ہے، پھر بھی مزید اطمینان خاطر کے لیے میں نے چند ماہ پیشتر مولانا اسید الحق عثمانی بدایونی کو فون کیا، موصوف نے کہا کہ مجھے اس کی تحقیق نہیں ہے، پھر چند روز کے بعد میں نے انھیں خوش خبری دی کہ اس کی سند مل گئی ہے-

اب سے تقریباً دو ماہ پہلے مولانا اسید الحق صاحب نے قصیدتان رائعتان پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر ارسال کیا تھا- یہ مقالہ نہایت وقیع اور پُر مغز ہے، تحقیقی کاوشیں لائق تحسین وآفرین ہیں-

اس مقالے سے علم ہوا کہ یہ قصیدہ اور ایک دوسرا قصیدہ ''حمائد فضل الرسول'' خود مصنف اشعار کے ہاتھ کا لکھا ہوا کتب خانہ قادریہ بدایوں شریف میں محفوظ ہے، لیکن اس کی وضاحت نہیں ہے کہ ان دونوں قصیدوں کو ''قصیدتان رائعتان'' کا نام کس نے دیا، بہر حال یہ قصیدے پورے طور پر بخط مصنف محفوظ ہیں، یہ خوشی کی بات ہے اور نام بھی اچھا تجویز ہوا ہے-

موصوف نے قصیدہ نونیہ کے متذکرہ بالا مصرع کے تحت خود مصنف علیہ الرحمہ کا وضاحتی حاشیہ یہ رقم کیا ہے:

''القران علی فعال بنقل حرکة الهمزة الی الراء وحذفها لغة شائعة فی القراٰن علی فعلان و بهما قرء القران فی القراٰن''

یہاں حضرت مصنف سے منسوب جملہ ''القران علی فعال'' میرے نزدیک محل نظر ہے، حالاں کہ یہ قصیدہ از ہر شریف کے بعض محققین کی نظروں سے گزر چکا ہے، فاضل بریلوی کی حاشیہ اور بین السطور کی وضاحتیں بھی ان کے پیش نظر تھیں اور یہ قصیدہ انتقادی نظر سے بھی دیکھا گیا ہے، لیکن حیرت ہے کہ کسی کی نگاہ ''القران علی فعال'' پر نہیں ٹھہری، اس خیال کے بعد تھوڑی دیر کے لیے میں پس وپیش میں تھا، لیکن ہزار غور وفکر کے بعد بھی کہیں سے چول بیٹھتی نظر نہیں آئی-

بالآخر نتیجہ یہی نکلا کہ حضرت مصنف کا جملہ نقل کرنے میں سہو ہوا ہے، کیوں کہ حضرت مصنف کا مابعد کا جملہ ''لغة شائعة فی القرآن علی فعلان''، جملۂ اول یعنی ''القران عل فعال'' کی نفی کرتا ہے-

اس سلسلہ میں اپنے وطن مالوف مبارک پور کی حاضری میں راقم نے مفتی محمد نظام الدین رضوی کی خدمت میں ایک معروضہ پیش کیا جو درج ذیل ہے:

محترم مفتی محمد نظام الدین رضوی بالقابہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ

معروض خدمت کہ قصیدتان رائعتان کا نسخہ خطی بقلم حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کتب خانہ قادریہ بدایوں شریف میں محفوظ ہے، ان قصائد پر ایک تحقیقی مقالہ مولانا اسید الحق ازہری نے لکھا ہے جو پُر مغز ہے- فاضل بریلوی نے ایک مصرع کے تحت میں جو وضاحت فرمائی ہے اس کی مزید تشریح مطلوب ہے، مصرع مع عبارت بین السطور درج ذیل ہے:

'' او علم تاویل القران فیاله

القران علی فعال بنقل حرکة الهمزة (خط میں

''حرکتہ'' لکھنے سے رہ گیا تھا: شرر) الی الراء وحذفھا لغة شائعة فی القران علی فعلان و بھما قرء القران''
(منقول از تحقیقی مقالہ)

طالب فیض
شرر مصباحی
۲۰/اکتوبر ۲۰۱۳ء

عریضے کا یہ محققانہ جواب عطا ہوا:

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

کرم فرمائے بندہ، محترم شرر مصباحی صاحب!
زادکم الرحمٰن فضلاً

خدا کرے مزاج شریف بعافیت ہو!

''اوعلم تاویل القران فیالہ''

اس مصرع میں ''قُران'' بروزن ''زبان'' و ''دخان'' ہے جب کہ مشہور قُرۡءَان بروزن ''نعمان وسبحان'' ہے، اس وجہ سے یہاں کسی قاری کے دل میں تسامح کا خلجان پیدا ہوسکتا تھا، اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے یہاں اسی خلجان کا دوطرح سے ازالہ فرمایا ہے:

۱- قُران بروزن فعال کا استعمال عام ہے، یہ علم الصرف کا قاعدہ مسلمہ ہے کہ حرف ساکن، غیر مدہ زائدہ وغیر یائے تصغیر کے بعد ہمزہ متحرک ہوتو حرف ساکن کو ہمزہ کی حرکت دے کر اسے حذف کرسکتے ہیں جیسے یَسۡئَلُ سے یَسَلُ، وَقَدۡاَفۡلَحَ سے وَقَدَ فۡلَحَ اور یَرۡمِیۡ اَخَاہُ سے یَرۡمَیخاہ اور اَلۡاَرۡض سے اَلَرض ایسا تخفیف کے لیے کرتے ہیں-

(ملاحظہ ہو علم الصیغہ، ص۳۰ باب سوم، فعل اول، مجلس برکات وپنج گنج، ص:۱، فصل دوم در صرف مہموز، مجلس برکات)

رسم قرآنی اور علم القراءت کی کتابوں میں بھی یہ صراحت ہے- لفظ قرءان میں بھی حذف ہمزہ کے جواز کا یہ قاعدہ جاری ہے- لہٰذا قران بروزن دخان بھی پڑھنا جائز ہے اور قُرۡءَان بروزن ''سبحان بھی''- بین السطور کی عبارت ''القران علی فعال بنقل حرکة الھمزة الی الراء'' ہے-

۲- وبھما قرء القران کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی قراءت ہمزہ کے ساتھ بھی ہے اور بغیر ہمزہ کے بھی اور یہ دونوں قراءتیں متواتر ہیں-

سورۂ بقرہ:۱۸۵	اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُراٰن
سورۂ نساء:۸۲	اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ القراٰن
سورۂ مائدہ:۱۰۱	حین ینزل القراٰن

وغیرہ آیات میں امام ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی قراءت قُران بروزن فعال ہے-

علم القراءت کی کتابوں میں صراحت ہے کہ:

القُرۡءَانُ، قُرۡءَاناً، قُرۡءَانه جب اسم ہوتو امام ابن کثیر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ''ر'' کے بعد ہمزہ نہیں پڑھتے بلکہ اس کی حرکت نقل کر کے ''ر'' کو دے دیتے ہیں اس طرح وہ ایسے تمام مقامات پر القران، قرانا، قُرانه بروزن فعال، دخان وزبان پڑھتے ہیں اور وقفاً امام حمزہ بھی ابن کثیر ہی کی طرح پڑھتے ہیں اور باقی قرا ''ر'' کے بعد ہمزہ پڑھتے ہیں، نقل حرکت نہیں کرتے (ماخوذ از تیسیر و شاطبیہ وتسہیل)

اور مرزا اسد اللہ غالبؔ نے قران بروزن زبان پر جو سخت تنقید کی ہے وہ ناواقفی کی بنا پر ہے- اس کی تحقیق کے لیے رشید حسن خاں کی کتاب ''زبان اور قواعد'' ص ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴ دیکھ سکتے ہیں-

مصروفیات کے ہجوم میں آپ کا والا نامہ ملا، جلد ہی آپ کو دہلی بھی جانا ہے، اس لیے بلا تاخیر فرمائش کی تعمیل کی-

فقط والسلام
محمد نظام الدین الرضوی
خادم الافتاء: دارلعلوم الاشرفیہ مبارک فور
۱۵/ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ/ ۲۰۱۳/۱۰/۲۱ء

مفتی صاحب نے علم الصرف کے حوالے سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ میرے علم میں اضافے کا سبب بنا- معتبر معاجم کے مطالعے کے بعد تو میں پہلے ہی مطمئن ہوکر مولانا اسید الحق ازہری صاحب کو خوشخبری

سنا چکا تھا، مگر میرے عریضے میں جو یہ عبارت تھی ''فاضل بریلوی نے ایک مصرع کے تحت میں جو وضاحت فرمائی ہے اس کی مزید تشریح مطلوب ہے'' اس میں وضاحت کی تشریح کا ایک حصہ "القران علی فعال" بھی تھا، اس پر مفتی صاحب نے غور نہیں فرمایا، حالاں کہ اتنا حصہ خالص علم الصرف سے متعلق تھا۔

اعلیٰ حضرت کی پوری وضاحتی تحریر سے بھی ظاہر ہے کہ یہ بحث علم الصرف سے متعلق ہے، مفتی صاحب نے بھی اسی حوالے سے جواب عنایت فرمایا ہے۔ میں حیران ہوں کہ صرفی اعتبار سے 'القران علی فعال' کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟ یہ وزن، وزن عروضی تو ہو سکتا ہے لیکن وزن صرفی نہیں ہو سکتا، کیوں کہ لغات عرب میں ایک کلمہ بھی ایسا نہیں ہے جو فعال کے وزن پر ہو اور اس کا حرف آخر حرف مادہ (حرف اصلی) نہ ہو۔

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ اگر علم الصرف کی بحث کے دوران کہا جائے کہ **الاختیار علی انفعال** یا **الانکسار علی افتعال** تو یہ غلط ہوگا۔ **الاختیار علی افتعال** اور **الانکسار علی انفعال** صحیح ہوگا۔ حالاں کہ خود افتعال اور انفعال عروضی اعتبار سے ہم وزن ہیں۔ عروض میں حرکت وسکون کے توافق کا اعتبار ہے (وہ بھی حروف ملفوظی میں) جب کہ علم الصرف میں حروف مادہ کا توافق بھی ہونا چاہیے۔ قُران اور دُخان عروضی اعتبار سے تو ہم وزن ہیں لیکن صرفی اعتبار سے ہم وزن نہیں ہیں، کیوں کہ قران کا نون حرف مادہ نہیں ہے جب کہ دخان کا نون حرف مادہ ہے، اسی لیے جن علمائے صرف نے لفظ ''مرجان'' میں ''رج ن'' کو حرف مادہ قرار دیا ہے، ان کے نزدیک اس کا وزن ''مفعال'' ہے اور جو ''م رج'' کو حرف اصلی قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک اس کا وزن ''فعلان'' ہے۔ اس بنا پر مجھے یقین ہے کہ اعلیٰ حضرت نے "**القران علی فعان**" لکھا ہوگا، کیوں کہ بحث کا مدار علم الصرف ہے، عروضی وزن مراد لینے میں علم الصرف حائل ہے۔

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا ''فاضل بریلوی کا مابعد کا جملہ "**لغة شائعة فی القران علی فعلان**" جملہ سابقہ یعنی جملہ منسوبہ "**القران علی فعال**" کی نفی کرتا ہے۔ وہ یوں کہ حضرت امام علم الصرف کی رو سے خود اس کی توجیہ فرماتے ہیں" **بنقل حركة الهمزة الى الراء وحذفها**" یہ تقریر صاف صاف "**القران علی فعان**" کی مشیر ہے۔ اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ فعلان اور قرءان میں لام اور ہمزہ دونوں مقابل میں ہیں، ہمزہ کی حرکت نقل کر کے ماقبل کو دے دی گئی اور ہمزہ حذف کر دیا گیا، یعنی فعلان کے لام کی حرکت نقل کر کے عین کو دے دی گئی جو پہلے ساکن تھا، اب ہمزہ کی حرکت منقولہ سے وہ مفتوح ہو گیا اور لام کو حذف کر دیا اب جو بچا وہ ''فعان'' ہے۔ اسی طرح سے القرءان میں نقل حرکت اور حذف ہمزہ کے بعد جو بچا وہ ''قُران'' ہوا، جسے عروضی اعتبار سے دخان کے وزن پر کہہ سکتے ہیں۔ لیکن صرفی اعتبار سے یہ دخان (فعال) کے وزن پر نہیں کہا جائے گا (جیسا کہ مفتی صاحب نے اپنے جوابی مکتوب میں تحریر فرمایا ہے) کیوں کہ دخان کا نون حرف اصلی ہے اور قران کا حرف مادہ ''ق ر ء'' ہے یعنی نون زائد ہے۔ اسی لیے ائمہ لسان نے بہ اختلاف حروف مادہ لفظ عنوان کو فُعلان اور فُعوال کے وزن میں بھی اختلاف کیا ہے، جو اہل علم ''ع ن و'' یا ''ع ن ی'' کو حروف اصلیہ قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک اس کا وزن فعلان ہے اور جو ''ع ن ن'' کو حروف مادہ قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک اس کا وزن فعوال ہے۔

اس لیے میں محترم مولانا اسید الحق صاحب سے التماس کروں گا کہ وہ حضرت امام کے نسخۂ خطی کو دوبارہ ملاحظہ فرمائیں، ان شاء اللہ تعالیٰ ''القران علی فعان'' لکھا ہوا ملے گا۔

□□□

☆T-181 سیکنڈ فلور، ماڈل بستی، چمیلیان روڈ، نئی دہلی-۵

صادق رضا مصباحی☆

بڑی شخصیتیں کسی کی جاگیر نہیں ہوتیں!

سید ملت حضرت سید حسنین میاں نظمی کے سانحۂ ارتحال پر اشک بار قلم سے لکھے گئے چند محسوسات ومشاہدات

ھـــم عجب قوم ہیں، ہم بڑی جلدی سازشوں کے شکار ہوجاتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف غلط فہمیوں کی گٹھری ساتھ لیے پھرتے ہیں اور اس کی بنیاد پر بغیر تحقیق غیر تو غیر اپنوں کے لیے بھی ایسا طرز عمل اختیار کرتے ہیں جو ہمیں سیدھا منافرت اور عداوت تک پہنچا دیتا ہے- اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنے ذہن کی نہایت کم ترین سطح پر کھڑے ہوتے ہیں اور ہمارے شعور کی وادی بدترین قحط کا شکار ہوتی ہے، اس لیے ہم منفی باتیں کرنے اور سننے کے عادی بخار میں مبتلا ہوجاتے ہیں- ہم یہ بھی نہیں دیکھتے کہ جس شخصیت پر ہم نشانہ سادھ رہے ہیں اس میں کتنی خوبیاں ہیں اور اس کی ذات سے دین و ملت کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے، بلکہ ہم تو اس ٹوہ میں رہتے ہیں کہ اس میں خرابیاں کتنی ہیں اور اسے کس طرح مجروح کیا جاسکتا ہے- ہمارے شعور کی عدم بلوغت کی انتہا یہ ہے کہ جزوی مسائل میں اختلافات کو ایسی شکل دے دیتے ہیں جیسے وہ کوئی اصولی معاملات ہوں اور ان اختلافات سے دین کی بنیادیں منہدم ہوئی جارہی ہوں- اہل علم کی ایسی ایک نہیں درجنوں مثالیں ہیں، جو صرف اسی وجہ سے مطعون قرار دیے گئے اور دیے جارہے ہیں اور ان کو بلاوجہ نزاعات کے دائرے میں گھسیٹا جارہا ہے- اس طرح کے رویے زندہ قوم کی علامت نہیں ہوتے- زندہ قومیں بڑی شخصیات سے عشق کی حد تک لگاؤ رکھتی ہیں اور ان کے کارناموں پر فخر کرتی ہیں، اس لیے ہمیں اعتراف کرلینا چاہیے کہ ہم ''مردہ'' قوم ہیں جو اپنے فن کاروں، شاعروں، ادیبوں، عالموں اور دانشوروں کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں- ہمیں اس حقیقت کا بھی اعتراف کرلینا چاہیے کہ ہم دین کے حقائق کو سمجھ نہیں پارہے ہیں اور عوام کو بھی دین کے محدود تصور کی تلقین کررہے ہیں- ہمارے اس مفروضہ محدود تصور کے چوکھٹے میں جو فٹ بیٹھتا ہے ہم اسی کو صحیح سمجھتے ہیں اور جو اس دائرے سے باہر نظر آتا ہے اسے دین سے باہر کا راستہ دکھاتے ہیں- ہم مہم چلا کر اپنے بڑوں، عظیم شخصیتوں، فن کاروں، دانشوروں کو متنازع بنانے، غلط فہمیوں کی دھند میں لپیٹنے اور ان کے لیے نازیبا الفاظ کہنے، کہلوانے اور لکھنے، لکھوانے سے بھی نہیں چوکتے- ہم ناقدروں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ بڑی شخصیتیں کسی کی جاگیر نہیں ہوتیں، ان پر کسی سلسلے، کسی خانقاہ اور کسی مشرب کی مہر نہیں لگی ہوتی- یہ بوئے گل کی طرح مہکتی ہیں اور لوگوں کو مہکاتی چلی جاتی ہیں- اگر ان شخصیات پر اہل خاندان، اہل محلّہ، اہل شہر، اہل عقیدت اور اہل سلسلہ اپنا حق جتائیں اور ان کے اردگرد بڑے بڑے حصار قائم کردیں تو گویا وہ ان کی شخصیت کو دبانے کی کوشش کررہے ہیں- اہل عقیدت اسے محبت وعقیدت کا نام دیتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ محبت نہیں عداوت ہے، غیر محسوس عداوت- اور آگے چل کر یہی ''محبت'' شخصیت کو پھلنے پھولنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے- ہماری کم نصیبی یہ ہے کہ بڑی شخصیتوں کے ساتھ ہم اسی طرح کی ''محبت وعقیدت'' رکھتے ہیں- ہمارے عوام ہی نہیں خواص کہے جانے والوں لوگوں کی ایک بڑی اکثریت کچھ ایسی ہی ''محبت'' کی شکار ہے-

اتنی لمبی چوڑی تمہید کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ہمارے ممدوح سید ملت حضرت سید حسنین میاں نظمی مارہروی علیہ الرحمہ بھی کچھ ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہوئے- حضرت سید ملت اپنے فکروفن کی بنیاد پر جماعت اہل سنت کی ایک عظیم شخصیت تھے- نعتیہ شاعری کی دنیا میں امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ العزیز کے بعد جو چند شخصیتیں نمایاں ہوئیں، ان میں ایک نام سید ملت کا ہے- عظیم شخصیتوں کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ ان کی باتیں، مقولے، اشعار اور کہاوتیں لوگوں کی زبانوں پر اس طرح چڑھ جاتی ہیں کہ پھر بمشکل ہی وہاں سے اترتی ہیں- اصل شاعر اور بانی کا نام کسی کو بھی نہیں معلوم ہوتا، مگر ان کے ملفوظ ہماری گفتگوؤں اور مجلسوں میں غیر محسوس طور پر داخل ہوجاتے ہیں اور ہم ان کے اسیر ہوکر رہ جاتے ہیں- اس پس منظر میں دیکھیں تو حضرت نظمی غیر معمولی عظمت وانفرادیت کے حامل نظر آئیں گے- ان کے درجنوں اشعار زبان درزبان سفر کرکے غیریت کی سرحدوں کو عبور کرچکے ہیں اور زبانوں پر اس طرح سجتے، مہکتے اور مہکاتے ہیں کہ

لگتا ہے نظمی نے ان ہی کے باطن کی ترجمانی کر دی ہو- یہ اشعار ان کی شخصیت کا اہم ترین حوالہ اور شناخت قرار پا چکے ہیں-

حضرت نظمی ان حضرات میں سے ہیں جو اعلیٰ عصری تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ دینی تعلیم سے بھی بہرہ ور تھے اور کیوں نہ ہو وہ علمی اور روحانی طور پر مستند ترین شخصیت کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جانے والے عظیم شخصیت سید العلما حضرت علامہ مفتی سید شاہ آل مصطفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحب زادے تھے- حضرت سید ملت کی پرورش جب ایسے باکمال اور فیض بزرگ کی زیر نگرانی ہوئی ہو تو انہیں باکمال، بافیض اور لازوال بننا ہی چاہیے تھا- ۱۹۴۶ء میں پیدا ہونے والا یہ عظیم وجلیل مرد مجاہد ۶ نومبر ۲۰۱۳ء بروز بدھ ممبئی میں حیات کی سرحدوں کو عبور کر کے ایک ایسی دنیا میں پہنچ گیا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا لیکن ان کے کہے ہوئے کلمات اور ان کی نوک قلم سے نکلے ہوئے الفاظ انہیں دنیا بھر کے لاکھوں لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رکھیں گے-

حضرت سید ملت کا تخلص نظمی بچپن سے ہی میری شعور کی تہوں میں پیوست ہے- اللہ عزوجل کا فیض اور میرے والد محترم کی تربیت کا نتیجہ کہ مجھے بچپن سے ہی نعت نبی سننے کا شوق رہا ہے- میرے وطن مالوف پورن پور (پیلی بھیت) میں جہاں کہیں بھی کوئی چھوٹا بڑا جلسہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ میں وہاں شریک نہ ہوتا- اس زمانے میں ملک کے بڑے مشہور نعت خواں جناب مناظر حسین بدایونی کی سحر طراز آواز پورے ہندوستان میں گونج رہی تھی اور ان کی موجودگی کسی بھی جلسے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی- مناظر حسین صاحب زیادہ تر حضرت نظمی میاں کا ہی کلام پڑھتے- حضرت نظمی سے پہلا تعارف مناظر حسین بدایونی کی آواز کے ذریعے ہی ہوا- میرے گھر میں کئی کیسٹیں تھیں جن میں زیادہ تر مناظر حسین کی آواز میں حضرت نظمی کا کلام تھا- مجھے یاد ہے کہ ان میں سے کسی کیسٹ میں حضرت نظمی کی زبانی بھی ایک نعت محفوظ تھی- حضرت نظمی کی آواز سے نعت رسول کی سماعت کی سعادت پہلی بار اسی کیسٹ کے ذریعے حاصل ہوئی- یہ بہت مشہور و مقبول نعت سنسکرت میں ہے جس کا ایک شعر ہے:

کوٹی کوٹی پرنام نت مستک سکل پرجا جنم
ہے دین بندھو دَیا ندھی ابھی نندنم سوسواگتم
شاہ امم، شاہ امم

یہ حضرت نظمی کے کلام کا اثر تھا یا مناظر حسین بدایونی کی سحر طراز آواز کا کمال کہ حضرت نظمی کی کئی نعتیں میرے حافظے میں تھیں اور میں انہیں مجمع عام میں سنا کر عوام کو محظوظ کرتا اور خود بھی محظوظ ہوتا تھا- ان کا کلام سنتے سنتے اور پڑھتے پڑھتے مجھے ان کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور یہی شوق مجھے میرے والد صاحب کے ہمراہ سب سے پہلی بار مارہرہ شریف لے گیا- اس وقت عرس قاسمی خانقاہ شریف کے اندر ہوتا تھا- مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس موقع پر حضرت نظمی نے اپنی مخصوص آواز میں نعت شریف یا غالباً کوئی منقبت شریف سنائی تھی- اس کا ایک شعر نہ جانے کیسے میرے حافظے میں رہ گیا:

میم مدینہ مارہرہ کی عظمت ہے
اس گنبد کو اس گنبد سے نسبت ہے

۲۰۰۰ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ اشرفیہ مبارک پور حاضر ہوا- اس سال یا اس سے آنے والے سال یعنی ۲۰۰۱ء کے عرس حافظ ملت میں حضرت نظمی کے صاحب زادے حضرت مولانا سید سبطین حیدر قادری برکاتی کی دستار فضیلت ہوئی تو اس موقع پر حضرت نظمی میاں علیہ الرحمہ مبارک پور تشریف لائے تھے اور حافظ ملت، اشرفیہ نیز مصباحیوں کے بارے میں اپنے گراں قدر تاثرات بھی ارشاد فرمائے تھے- حضرت موصوف کی یہ دوسری زیارت تھی-

اکتوبر ۲۰۰۷ء میں ممبئی آیا تو ایک دن چند احباب کے درمیان حضرت نظمی کا تذکرۂ جمیل چھڑ گیا- میری آرزوے شوق حضرت کی دست بوسی اور قریب سے زیارت کے لیے انگڑائیاں لینی لگی، چنانچہ سہ ماہی ''افکار رضا'' کے مدیر جناب زبیر قادری نیز دیگر لوگوں کے ساتھ حضرت کے مکان 'برکاتی منزل' غالباً چوتھے مالے پر حاضری ہوئی- یہ حضرات بیعت ہوئے اور میں نے بھی حضرت کے دست اقدس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور برکاتی نسبتوں کی بہاریں لوٹنے لگا- یوں ۱۹۹۲ء میں حضرت علامہ مفتی اختر رضا خاں ازہری میاں کے نورانی ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دے کر آج برسوں بعد نسبت برکاتیت کی غیر معمولی سعادتیں بھی اپنے دونوں ہاتھوں سے بٹور رہا تھا- میں رضوی نسبت کا حامل تو تھا ہی، برکاتی نسبت کا بھی اہل ہو گیا اور ویسے بھی میرے فہم ناقص میں برکاتی اور رضوی میں کوئی فرق نہیں ہے- دونوں نہریں ایک ہی دریا میں جا گرتی ہیں- جو برکاتی ہے وہ رضوی بھی ہے اور جو رضوی

بھی ہے وہ برکاتی بھی ہے- چنانچہ جولوگ رضوی ہونے کے باوجود خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ کے شاہ زادگان کے خلاف بدتمیزیاں کرتے ہیں وہ رضوی ہیں ہی نہیں، چاہے وہ اپنی تمام توانائیوں کو یک جا کر کے دعویٰ رضویت کیوں نہ بلند کریں- اسی طرح جو برکاتی خانقاہ رضویہ کے حوالے سے اپنی ناک بھنوں چڑھاتے ہیں وہ بھی حقیقتاً برکاتی نہیں ہیں- ایک دوسرے سلسلوں کے خلاف صف آرا ہونے والے لوگوں کو اندازہ نہیں ہے کہ وہ کس قدر بھیانک غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں- شاہ زادگان مارہرہ مطہرہ کی شان میں توہین کر کے وہ امام احمد رضا اور حضور مفتی اعظم ہند علیہما الرحمۃ والرضوان کی روح کو ایذا پہنچا رہے ہیں اور خانقاہ رضویہ کے لیے نازیبا الفاظ کہنے والے مشائخ برکات علیہم الرحمۃ والرضوان کو ناخوش کر رہے ہیں-

بہرحال بیعت کے بعد ایک رجسٹر میں ہم سب لوگوں کے نام درج کیے گئے- مجھے یاد آتا ہے کہ اس موقع پر حضرت علیہ الرحمہ نے ہم سب کی چائے سے ضیافت بھی کی تھی - اس ملاقات میں مجھے بہت قریب سے حضرت کی زیارت کا موقع ملا-

خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ پر اللہ عزوجل کا ایسا فضل اور حضور سیدۂ کائنات حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ایسا فیض ہے کہ اس کا ہر ہر فرد اپنی مثال آپ ہے- مجھے حضرت نظمی بھی اپنی مثال آپ نظر آئے- ان کی حیات کا بہت مخصوص اور خوب صورت عنوان تو نعتیہ شاعری ہے مگر ان کی تصنیفات، تالیفات اور تراجم کا اچھا خاصا اور وقیع ذخیرہ بھی ہمیں حضرت کی ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا- ان کی شاعری عشق رسول میں گندھی ہوئی ہے اور یہ شاعری محض برائے شاعری نہیں ہے، بلکہ مقصدیت سے بھرپور ہے- اس میں عشق رسالت کی جلوہ طرازیاں بھی ہیں اور عقائد اہل سنت کی جلوہ افروزیاں بھی- انہوں نے اپنی نعتیہ شاعری کے ذریعے محبت نبی کے تو گن گائے ہی ہیں، اسلام کی بنیادی تعلیمات کو فروغ بھی دیا ہے - اگر ان کی ساری تصانیف اور دیگر کارنامے ایک طرف رکھ دیے جائیں تب بھی یہ نعتیہ شاعری ان کی اعلیٰ ترین علمی وادبی حیثیت متعین کرنے کے لیے کافی ہے- ان کے اشعار میں جو کشش ہے وہ دور دور تک نظر نہیں آتی - اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی شاعر کے تمام اشعار اس پائے کے نہیں ہوتے کہ ان سب کو مقبولیت کا درجہ مل سکے- صرف چند اشعار یا چند ہی نعتیں یا منقبتیں ہوتی ہیں جو اس کی شناخت کا حوالہ قرار پاتی ہیں مگر حضرت نظمی کا معاملہ دوسروں سے ذرا مختلف ہے- ان کے زیادہ تر اشعار مقبول عوام وخواص ہیں-

حضرت کی شخصیت بہت سوں کے لیے ایک عظیم مثال کی حیثیت رکھتی ہے- انہوں نے صرف عصری تعلیم حاصل نہیں کی بلکہ دینی ومذہبی تعلیم بھی حاصل کر کے اپنے عقیدت مندوں اور وابستگان سلسلہ کو یہ پیغام دیا کہ عصری تعلیم میں درک حاصل کیے بغیر دنیا میں اچھی طرح زندگی نہیں گزاری جا سکتی اور دینی تعلیم میں مہارت حاصل کیے بغیر دین کی صحیح تفہیم نہیں ہو سکتی - عصری تعلیم دنیا میں کامیابی کی ضمانت ہے اور دینی تعلیم آخرت میں کامیابی کی ضمانت- بچپن میں ان کے والدین نے ان کی تربیت دینی منہج پر کی تھی- ان کے خاندان میں درجنوں آفتاب وماہتاب تھے، اس لیے گھر پر ہی ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر عصری تعلیم کے لیے کالج کا رخ کیا اور ۳۳ سال تک حکومت کی اعلیٰ ترین ملازمت کی- اس دوران دینی مطالعہ بھی کرتے رہے، نعتوں کے گلدستے بھی سجاتے رہے اور اپنا حاصل مطالعہ بھی کتابی صورت میں پیش کرتے رہے اور جب تک آپ کی زندگی کا سرمایہ ختم نہیں ہو گیا، انہوں نے اپنے آپ کو کام کے حوالے کیے رکھا اور کام نے بھی اپنے آپ کو پورے طور پر ان کے حوالے کر دیا- حضرت نظمی بظاہر دیکھنے بھالنے میں ایک عام سے انسان معلوم ہوتے، مگر وہ علم وروحانیت کے سنگم تھے اور عمل کے پیکر-

ان کی نظر میں شاید یہ دعا تھی: **اللھم ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار** اس لیے دین کی بنیادی تعلیمات کے حصول کے بعد انہوں نے سب سے پہلے عصری تعلیم کی طرف قدم بڑھائے اور اعلیٰ ترین ملازمت تک پہنچے اور اس کی بنیاد پر جب خوش حالی میسر آئی تو وہ خاموشی کے ساتھ دینی کاموں میں لگ گئے- دوران ملازمت ان کا دینی مطالعتی سفر جاری رہا اور رٹائرمینٹ کے بعد اس سفر میں مزید تیزی آ گئی- انہوں نے یہ نہیں کیا کہ پہلے عصری تعلیم میں منہمک ہو گئے ہوں اور پھر جب وقت ملا ہو تو دین کی طرف مائل ہوئے ہوں- حضرت نظمی کی تربیت جس نہج پر ہوئی تھی اس منہج پر انہوں نے اپنے بچوں کو بھی پروان چڑھایا- سب سے پہلے انہیں دین کی بنیادی تعلیم سے آشنا کرانے کے بعد اعلیٰ عصری تعلیم دلائی تاکہ وہ دنیا میں اچھی اور خوش حال زندگی گزارنے کے لائق بن سکیں- پھر

اس کے بعد دین کی اعلیٰ تعلیم کی طرف متوجہ کرایا اور انہیں عالم دین بنا دیا- اس سے ایک بات سمجھ میں آئی کسی بھی بچے کو سچا اور حقیقی مسلمان بنانے کے لیے پہلے دین کی بنیادی تعلیمات سے آشنا کرانا انتہائی ضروری ہے اور دینی تربیت لازمی- اس کے بعد آپ چاہیں تو اسے دین کی اعلیٰ تعلیم دلائیں یا عصری تعلیم، وہ بچہ کہیں بھی بہک نہیں سکتا- ہمارے آج کے نوجوان فکری طور پر آوارگی اور گمراہیت کی طرف اس لیے بڑھ گئے ہیں کہ ان کے والدین نے بچپن میں انہیں دینی تعلیم وتربیت سے آشنا ہی نہیں کرایا-

حضرت نظمی کی پوری حیات خدمت لوح وقلم میں گزری اور وہ پوری زندگی اپنے ابا جان حضور سید العلما حضرت علامہ مولانا سید آل مصطفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عکس جمیل اور جانشین بنے رہے- بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ ایک عظیم نعت گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محقق، صحافی، دانشور اور کئی زبانوں پر حد درجہ عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ ۳۹ مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں کے مصنف، مؤلف اور مترجم تھے- یہاں ایک سوال یہ ہے کہ پھر ہم نے اتنی بڑی شخصیت کے ساتھ انصاف کیوں نہیں کیا؟ یہاں بھی ہم ناقدروں کی ناقدری آڑے آئی، ہمارے مزاج کے منفی رجحانات سامنے آئے اور اپنے پیر سے بے انتہا عقیدت مندی اور دوسرے سے لاتعلق ہونے والی کیفیت رکاوٹ بن کر کھڑی ہوگئی- ہمارا مزاج یہ ہے کہ ہم اگتے سورج کو سلام کرتے ہیں اور ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ لیتے ہیں اور پھر دیوانہ وار اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں چاہے، وہ دور سے چمکتی ہوئی چیز سراب ہی کیوں نہ ہو- آج چاپلوسی، خوشامد کو کامیابی کا معیار سمجھا جا رہا ہے- لوگ چاپلوسی کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں اور جو صحیح بات کرے، حق بات سنائے اور اچھے کو اچھا اور برے کو برا کہے اور اسی کے مطابق عمل کرے اسے اپنے گھر کی چوکھٹ سے ہی باہر کا راستہ دکھا دیتے ہیں- مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ ہمارے مذہبی اشرافیہ کے اردگرد چاپلوس ٹولے کا گھیرا اتنا سخت ہے کہ اسے توڑنا ناممکن سا لگتا ہے- یہ چاپلوس، خوشامدی لوگ ہمارے بڑوں سے جو چاہتے ہیں کروا لیتے ہیں اور جو چاہتے ہیں کہلوا لیتے ہیں- یقین مان لیجیے کہ آج ہمارے درمیان نزاعات، غلط فہمیوں اور دوسروں کے ساتھ لاتعلقی کا جو سلسلہ ہے اس کا ذمے دار یہی چاپلوس ٹولہ ہے- یہ بڑوں کے ساتھ پانچ کو پچاس بنانے کے چکر میں لگا رہتا ہے، اسے نہ دین کی فکر ہے اور نہ عوام کی-

حضرت نظمی میاں بھی ایک بڑی خانقاہ کے پیر تھے، ان کے بھی ہزاروں مریدین دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں، مگر اس کے باوجود ان کا حلقہ اتنا وسیع نہیں ہوسکا، کیوں؟ اولاً تو انہوں نے اپنی عمر کا تقریباً نصف حصہ ملازمت میں گزارا اور بیعت وارادت سے دور ہی رہے- دوسرے یہ کہ وہ چاپلوس لوگوں کو اپنے آس پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتے تھے، جسے حق سمجھتے اسی کو حق کہتے اور اسی کی تلقین کرتے اور جو چیز ان کے نزدیک بری ہوتی ان کی فکر اور ان کے عمل سے وہ اسی انداز سے ظاہر ہوتی تھی- وہ حق گو تھے، کسی بڑے منصب اور بڑی حیثیت کا لحاظ کیے بغیر اپنا نظریہ پیش کر دیتے تھے اس لیے ان کے پاس چاپلوسوں کی دال نہیں گلتی تھی- اسی لیے نہ وہ پیرانہ ٹھاٹ باٹ تھے جو آج کل کے پیروں کے مقدر میں ہیں اور نہ وہ پیرانہ طمطراق تھا جو پیران عظام عموماً اپنے لیے روا رکھتے ہیں-

اصل میں ہماری قوم میں شعور کا قحط ہے اور قحط جب پڑتا ہے تو وہ پوری آبادی کو نگل جاتا ہے- اس شعور کے قحط نے ہماری ذہنی توانائیوں کو نگل لیا ہے اور مثبت اور تعمیر کی جگہ منفی اور تخریب نے لے لی ہے- ہمارے حضرت حسنین میاں علیہ الرحمہ بھی اس کی زد میں آ گئے تھے- گزشتہ چند سالوں سے ہمارے کچھ بھائیوں نے ان کے خلاف جو طوفان کھڑا کیا تھا وہ اس کی گرفت سے بچ نہ سکے- موبائل پر حضرت نظمی میاں اور ان کے صاحب زادے کو نازیبا باتیں سنائی جاتیں، نجی مجلسوں اور بعض جلسۂ عام میں بھی ان کی شان کے خلاف نامناسب باتیں کہی جاتیں، اسی وجہ سے اگر کبھی کبھار ان حضرات کی زبان سے تنگ آکر غصے میں کوئی بات نکل جاتی تو لوگ اسے سند بنا لیتے اور جگہ جگہ اس کی تشہیر کرنا دین کی سب سے بڑی خدمت تصور کرتے-

خدارا اہل سنت کے لیے عظیم ترین سرمائے کی حیثیت رکھنے والی ان جیسی عظیم ترین شخصیات کے ساتھ اس طرح کا بھونڈا مذاق بند کیا جائے اور جزوی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کی علمی، فکری، سماجی اور مذہبی حیثیت کا اعتراف کیا جائے ورنہ نفرتوں اور کدورتوں کی دیواریں مزید بلند ہو جائیں گی- اپنا مزاج اس طرح تشکیل دیا جائے کہ ساری خانقاہوں کے سارے مشائخ عظام ہمارے سر کے تاج ہیں اور ہم اپنے بڑوں کی کسی بھی طرح کی مخالفت اور نازیبا گفتگو کرنا اور

سننا برداشت نہیں کر سکتے -ہمیں اپنے بچوں، شاگردوں اور چھوٹوں کی تربیت بھی اسی نہج پر کرنی چاہیے کہ ان کے دلوں میں بڑوں کی عظمت ورفعت کے نقوش قائم ہوں اور وہ ان کے بنائے ہوئے خطوط پر ہی اپنا سفر حیات مکمل کریں-

کیا اس طوفان کی کسی کو خبر ہے کہ اسکولوں، کالجوں اور ہمارے بعض مدارس ومکاتب کے سطحی نظام ونصاب سے ہمارے بچے اپنی قدروں سے غافل ہوتے جارہے ہیں اور اپنے ہی اسلاف کے کارناموں بلکہ ناموں تک سے ناآشنا؟ آج کی ۹۰ فی صد جدید نسل کو معلوم ہی نہیں کہ ہمارے اسلاف اور ہمارے آباواجداد نے اپنے مذہب، اپنی ملت اور اپنے ملک کے لیے کس قدر گراں مایہ کارنامے انجام دیے ہیں- جانتے ہو اس کا سبب کیا ہے؟ اس کی اہم ترین وجہ یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے متحارب ہیں- اگر ہم کسی ایک شخصیت کی چوکھٹ پر اپنی ساری عقیدتوں اور نیازمندیوں کی زنبیل لاکر رکھ دیتے ہیں تو اسی کے ہم پلہ دوسری شخصیت کے ساتھ ہمارا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہوتا ہے- ظاہر ہے جب ہمارے دل میں چور ہوگا تو ہم اپنے بچوں، شاگردوں اور چھوٹوں کے سامنے ان شخصیات کا فراخ دلی اوراحترام وعقیدت کے ساتھ ذکر ہی نہیں کریں گے- ایسی صورت میں نئی نسل کو کیسے معلوم ہوگا کہ ہمارے بڑے کس قدر اہمیت کے حامل ہیں- ہمیں اپنی نسلوں کو بتانا چاہیے کہ مرتبۂ علمی اور رتبۂ شاعری میں حضرت نظمی میاں علیہ الرحمہ کا عزووقار کس پائے کا ہے- جدید ٹیکنالوجی کے زمانے میں پیدا ہونے والی یہ نسل اور ٹی وی، وی ڈی او اور انٹرنیٹ کے رسیا یہ بچے اپنے محسنوں کو بڑی تیزی سے بھولتے جارہے ہیں- ان کو اپنے بزرگوں اور اپنے ہیروؤں کے فن، صلاحیت اور اہمیت کا قدردان بنانا ہم سب کا مشترکہ ملی فریضہ ہے- ہمارے حریف تو ہماری شخصیتوں کو متعارف کرانے سے رہے، ہمیں ہی اس کے لیے آگے بڑھنا ہوگا- صرف مضامین لکھنے اور تقریریں کرکے خراج عقیدت پیش کرنے سے کام نہیں چلے گا- اللہ عزوجل ہمیں اپنے بڑوں کا قدرداں بنائے، ان کی حیثیتوں اور عظمتوں کا عملی اعتراف کرنا سکھائے اور حضرت سید ملت علیہ الرحمہ کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس کی بہاریں نصیب فرمائے- آمین

□□□

☆sadiqraza92@gmail.com

بقیہ: اظہار خیالات

لیکن افسوس کہ وہ یہ احسن طریقہ اپنانے کی بجائے سیاست دانوں کی خوشامد کو ترجیح دیتے رہے، جس کی وجہ سے انہیں جامعات کے شعبۂ اردو کے تحقیقی کاموں کی اہمیت کا علم بھی نہیں ہوسکا- مبصر کا شکریہ کہ انہوں نے ''نشیمن'' کے چھوٹ جانے کا ذکر کیا- پی ایچ ڈی کے مقالے میں شامل ہونے کے باوجود کتابی شکل دیتے وقت اس کی شمولیت نہیں ہوسکی، جس کا افسوس ہے- ان شاءاللہ تیسرے ایڈیشن میں آپ اس کا ذکر بھی پائیں گے-

ایڈیٹر صاحب! آپ کے رسالے میں شائع تبصرے کو پڑھ کر یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جاسکتا ہے کہ مبصر نے تبصرے کی زحمت صرف اس لیے کی، تاکہ اس حوالے سے ہی سہی ان کے دونوں اخبارات ''خبردار جدید'' اور ''جدید خبر'' کا ذکر آجائے اور آئندہ کوئی اسکالر اس موضوع پر کام کرے تو خوف زدہ ہوکر مذکورہ اخبارات کا تذکرہ کرنے پر مجبور ہو- سیاست دانوں کو بلیک میل کرتے کرتے اب اس کا دائرہ وسیع کیا جارہا ہے- ایسے خود میرا بھی ارادہ ہے کہ اس کتاب کی دوسری جلد میں چھوٹے چھوٹے اخبارات کا احاطہ کروں، تاکہ ایسے صحافیوں کے ''کارنامے'' اجاگر ہوسکیں، جو ''کاسہ لیسی'' کو پیشہ بناکر صحافت جیسے باوقار پیشے کو داغدار کرتے رہے ہیں-

ظاہر ہے ان میں مبصر اور ان کے دونوں اخبارات کا ذکر بھی شامل ہوگا اور قارئین کو بتایا جائے گا کہ اس طرح کے اخبارات کی تعداد اشاعت کتنی رہی ہے اور سرکاری دفاتر یعنی ڈی اے وی پی اور ڈی آئی پی وغیرہ میں کتنی تعداد میں نکلنے کا دعویٰ کیا جاتا رہا ہے- اس سلسلے میں آر ٹی آئی کارکنان تھوڑی توجہ دیں تو اس باوقار پیشے کو گدھوں سے پاک کرنے میں مدد ملے گی- قارئین کو جان کر حیرانی ہوگی کہ اس وقت صرف دہلی سے ۷۰/ سے زائد اردو روزناموں کو ڈی اے وی پی اور دیگر سرکاری اداروں کی مراعات حاصل ہیں- آپ خود بتائیں کیا ۷۰/ سے زائد اردو روزنامے دہلی میں نظر آتے ہیں؟ کیا مبصر کے وہ دونوں اخبارات نظر آتے ہیں، جن کے ذکر کو کتاب میں شامل نہ کرنے پر وہ اس قدر چراغ پا ہیں؟

□□□

خصوصی گوشہ

حضرت آسی: ایک نظر میں

نام: محمد عبدالعلیم

تاریخی نام: ظہورالحق

تخلص: آسی

القاب: بحرالاسرار، قاسم الانوار، قطب العرفا والعشاق

عرفیت: حضرت مولانا، سرکار آسی

ولادت: ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۲ء

مقام ولادت: مفتی محلّہ، قاضی پورہ، ضلع آرہ (بہار)

والد بزرگوار: حضرت شیخ قنبر حسین رشیدی (متوفی ۱۲۸۰ھ)

(مرید وخلیفہ قیام الحق شاہ امیرالدین رشیدی (متوفی ۱۲۶۵ھ) پانچویں سجادہ نشیں خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور)

حسب ونسب: آپ کا پدری نسب نامہ اپنے اجداد میں نویں پشت میں حضرت شیخ احمد مبارک چشتی عدنی (متوفی ۱۰۱۶ھ) جو اپنے عہد کے مرشد کامل اور حضرت مولانا مظفر بلخی قدس سرہٗ کی اولاد امجاد میں سے تھے کے ذریعے سے امیرالمومنین سیدنا حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے اور مادری نسب اپنے نانا مفتی احسان علی آروی کے ذریعے امیرالمومنین سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔

عقد مسنون: آپ کی شادی غازی پور محلّہ نورالدین پورہ میں منشی راحت علی صاحب کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی جن سے صرف

اساتذہ: پیر ومرشد قطب الہند شاہ غلام معین الدین رشیدی، نانا مفتی احسان علی آروی، علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنوی، مفتی محمد یوسف فرنگی محلی لکھنوی

تین صاحبزادیاں ہی تھیں۔

پیر ومرشد: قطب الہند حضرت شیخ معین الدین امیری رشیدی (متوفی ۱۳۰۷ھ)

منصب ومسند سجادگی: خانقاہ وآستانہ عالیہ رشیدیہ جون پور میں ۱۳۱۴ھ میں ہوئی

اولاد: تین صاحبزادیاں تھیں، جن میں جنت بی بی اور عزت بی بی شامل ہیں۔

تصانیف: دوران تدریس اپنے تلامذہ کی تعلیم کے لیے خود انہی کے نام سے منسوب نحو، صرف، منطق مختلف علوم وفنون پر مشتمل فوائد جوہریہ، سراج الصرف، فوائد محمدیہ، فوائد سراجیہ، رسالۂ فریدیہ، رسالۂ احمدیہ وغیرہ جیسی علمی وفنی کتابیں تصنیف فرمائیں اور خالص صوفیانہ اسرار وکنایات اور فوائد نکات پر مبنی عین المعارف (دیوان آسی) کے نام سے شعر وادب میں ایک اہم اضافہ فرمایا۔

تلامذہ: مولانا شاہ سراج الدین رشیدی (سجادہ نشیں خانقاہ رشیدیہ جون پور)، سید شاہد علی علیمی فانؔی گورکھ پوری (سجادہ نشیں خانقاہ رشیدیہ جون پور)، مولانا عبدالمجید کاتبؔ مصطفیٰ آبادی، مولانا سید محمد شادؔ غازی پوری مولانا علی گوہرؔ پھلواروی، مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی، فدائؔی جون پوری، مولانا محمد صدیق سکندر پوری، مولانا احمد حسین لبیبؔ سکندر پوری،

مولانا محمد احمد ایمنؔ سکندر پوری، حکیم شاہ فریدالدین احمد فریدؔ، شاہ معین الدین حسن معینؔ، شاہ محی الدین حسن حیاتؔ غازی پوری، شاہ شہاب الدین عمر احمد شہاب غازی پوری، مولانا عبدالصمد صمد غازی پوری، شیخ محمد حسین باقیؔ غازی پوری جیسے نامور اور باکمال علما وشعرا قابل ذکر ہیں۔

کمالات: عالم، فقیہ، صوفی، عارف، مصلح، واعظ، داعی، مصنف، طبیب، حکیم، شاعر اور خانقاہ رشیدیہ جون پور کے آٹھویں سجادہ نشین تھے۔

خدمات وکارنامے: آپ نے دینی ومذہبی، علمی وادبی، سماجی ومعاشرتی مختلف میدانوں میں اپنی گراں قدر خدمات پیش کیں، درس وتدریس اور تربیت وتزکیہ کے ذریعے صاحب فضل وکمال خلفا ومریدین اور نامور شعرا وتلامذہ پیدا کیے، مختلف علوم وفنون پر قابل قدر رسالے تحریر فرمائے، عین المعارف کی شکل میں شائقین علوم طریقت ومعرفت کو عمدہ سامان اور تحفہ عطا فرمایا اور عارفانہ وصوفیانہ شاعری کو فروغ دے کر اس میں ممتاز مقام حاصل کیا، چودہویں صدی ہجری میں تصوف وسلوک کی بہترین ترجمانی وعلم برداری کر کے تصوف وصوفیہ کے مشن کو آگے بڑھایا، سلسلۂ رشیدیہ جون پور کی تعمیر وتوسیع اور اس کے دائرۂ دعوت وارشاد کو خلفا ومریدین کے ذریعے ملک وبیرون ملک میں خوب وسیع وعام کیا۔

معاصرین: حضرت سید شاہ علی حسین اشرفی میاں کچھوچھوی، مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، مولانا شاہ عبدالقادر عثمانی بدایونی، مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی، مولانا شاہ انواراللہ فاروقی حیدرآبادی، شاہ حفیظ الدین لطیفی رحمٰن پوری، سید شاہ شہود الحق اصدق بہاری، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی، علامہ اقبالؔ، شاہ سراج الدین بیدم وارثی۔

خلفا: سید شاہ شاہد علی سبز پوش علیمی فانیؔ گورکھ پوری، حکیم سید شاہ عبدالعزیز بہاری، شاہ محمد اویس پھلواری، مولانا سید محمد فاخر بیخودؔ اجملی الٰہ آبادی، سید شاہ نذیر احمد بہاری، شاہ عبدالحق ظفرآبادی، مولانا شاہ عبدالسبحان گورکھ پوری، مولانا شاہ عبداللطیف رشیدی بلیاوی، شاہ ذاکر حسین قتال پوری، مولانا عبدالرحیم سیوانی، شاہ الفت حسین غازی پوری۔

ممتاز مریدین: مولانا شاہ سکندر علی علیمی رشیدی پورنوی، مولانا شاہ صوفی عبداللطیف رشیدی بلیاوی، مولانا ولی الرحمٰن ولی علیمی، مولانا سید شاہ عبدالشکور علیمی رشیدی سیوانی، مولانا یوسف علی علیمی رشیدی پورنوی، مولانا شاہ تفضّل حسین علیمی پورنوی، مولانا شاہ تاج الدین علیمی پورنوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

وصال مبارک: ۲؍جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۷ء

مزار پرانوار: محلہ نورالدین پورہ، غازی پور، ضلع بلیا (یوپی)

حضرت آسی: ارباب علم ودانش کی نظر میں

مولاناعبد الحلیم فرنگی محلی لکھنوی

حضرت (شاہ عبدالعلیم آسی غازی پوری) فرماتے تھے کہ

''میں نے کوئی کتاب نصف صفحہ اور ایک صفحہ سے زیادہ استاذ (مولانا شاہ عبدالحلیم فرنگی محلی) سے نہیں پڑھی''،نصف سطر یا ایک سطر کا مطالعہ فرمایا کرتے تھے اس میں رات کی رات گزر جاتی............نصف سطر اور ایک سطر کے سبق میں چھ سات گھنٹے صرف ہوتے تھے،استاد شاگرد دونوں پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے-نصف صفحہ ایک صفحہ کے بعد مولوی عبدالحلیم صاحب قدس سرہ کتاب بند کرادیتے اور فرماتے کہ اب کتاب ختم ہوگئی دوسروں کو پڑھاؤ-مگر حضرت (آسی) خود کتاب کا مطالعہ کر کے ختم کر لیتے-مولوی وکیل احمد صاحب سکندر پوری بھی جو حضرت (آسی) کے چچازاد بھائی تھے اور حیدر آباد دکن میں جج تھے،مولوی عبدالحلیم صاحب سے پڑھتے تھے،وہ جب کوئی اعتراض کرتے تھے تو مولوی عبدالحلیم صاحب غور وفکر کے بعد اس کا شافی جواب دے دیتے تھے،مگر جب حضرت ڈوب کر کوئی اعتراض کرتے تھے تو مولوی عبدالحلیم صاحب دو دو ہفتہ غور وفکر کے بعد کوئی کمزور سا جواب دیتے تو حضرت (آسی) فرماتے کہ''حضرت آپ استاد ہیں کہیے تو مان لوں مگر میرے اعتراض کا جواب نہ ہوا-''مولوی عبدالحلیم صاحب فرماتے کہ''کہتے تو صحیح ہو جواب نہیں ہوا،اب تم خود اپنے اعتراض کا جواب دو!''اس کے بعد حضرت خود اپنے اعتراض کا جواب دیتے تو مولوی عبدالحلیم صاحب خوشی سے پھولے نہ سماتے-''(عین المعارف ص:۴۱)

مرزا اسد اللہ غالبؔ

''حضرت (آسی) نے اپنی چند نکالی ہوئی غزلیں مولوی عبدالصمد صاحب کو دے دی تھیں،مولوی صاحب خود دہلی گئے تھے تو غالبؔ سے ملے اور وہ غزلیں سنائیں-غالبؔ دم بخود سنتے رہے،اس کے بعد فرمایا کہ

''اللہ اللہ ایسے لکھنے والے اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں!''(عین المعارف ص:۵۷)

مفتی یوسف فرنگی محلی لکھنوی

''جب مدرسہ حنفیہ جون پور سے مولوی عبدالحلیم صاحب لکھنؤ چلے گئے اور ان کی جگہ پہ حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحب تشریف لائے تو حضرت (آسی) ہدایہ پڑھنے کے لیے مفتی صاحب کے پاس تشریف لے گئے،مفتی صاحب نے فرمایا کہ فقیر کا معمول شمس بازغہ کے بعد ہدایہ پڑھانے کا ہے-حضرت نے فرمایا کہ میں شمس بازغہ پڑھ چکا ہوں،مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مثل عامی شاگردوں کے پڑھانا چاہا،حضرت (آسی) نے فرمایا کہ میں تین سطروں کا مطالعہ کر کے آیا ہوں،میں نے جو باتیں ان تین سطروں میں پیدا کی ہیں،اس کو سن لیجیے-حضرت نے تین گھنٹے تک ان تین سطروں پر تقریر کی-مفتی صاحب دم بخود سنتے رہے،جب حضرت تقریر ختم کر چکے تو مفتی صاحب نے فرمایا کہ

صاحبزادے!میں آپ کی ذہانت کی تعریف مولوی عبدالحلیم صاحب سے سن چکا ہوں-جب مجھے ایسے شاگرد کی تلاش تھی تو کوئی ملا نہیں،اب ضعیف ہو چکا ہوں،آپ کے پڑھانے کے لائق نہیں رہا اور آپ کو اس کی حاجت بھی نہیں ہے،خود کتاب دیکھ جایئے اور دوسروں کو پڑھایئے،اگر کوئی شبہ واقع ہو تو پوچھ لیجیے گا-''(عین المعارف ص:۴۲)

حکیم محمد اسحاق حاذقؔ موہانی

''حکیم محمد اسحاق حاذقؔ موہانی سے جب کوئی کہتا تھا کہ حضرت آسیؔ نے نہ تو کسی سے طب پڑھی نہ کسی کے مطب میں بیٹھے اور شفا کا یہ حال ہے جو مریض ان کے ہاتھ میں آیا وہ آناً فاناً صحت یاب ہوا،تو وہ فرماتے کہ ارسطو اور بوعلی سینا کو کس نے طب پڑھائی تھی؟یہ ان دماغ کے لوگوں میں

ہیں جو طب ایجاد کریں، ان کو استاد کی کیا ضرورت ہے؟'' (عین المعارف ص:۴۷)

علامہ کیفی چریا کوٹی:

''حضرت آسی اپنے وقت کے سجادۂ شاعری کے شیخ اعظم تھے-تصوف کی شاعری میں ان کا جو رنگ ہے، ان سے پہلے اور ان کے بعد کوئی ان کا مثل نظر نہیں آتا-'' (نیا دور دہلی ص:۳۳، اگست ۱۹۸۳ء)

لالہ سری رام

''آپ کے کلام سے آپ کی شوخی طبع، بلند پروازی، بندش مضمون، تلاش الفاظ مانوس وموزوں، برجستگی کلام، شستگیٔ زبان کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے، غرض اصناف علوم پر پورے پورے قادر اور ہر علم وفن سے بخوبی واقف وماہر ہیں-'' (خم خانۂ جاوید ص:۶۴،۶۵)

مولانا محمد علی جوہر

''اس سفر (بسلسلۂ مقدمۂ کراچی) میں رات کے طول طویل گھنٹے درود وسلام کی تسبیحیں پڑھتے پڑھتے گزار دیے اور آسی غازی پوری کا یہ شعر سارے سفر میں برابر ورد زبان رہا:

وہاں پہنچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد''

(قومی ڈائی جسٹ لاہور ص:۱۶۱، ۱۹۸۸ء)

فراق گورکھپوری

''آسی غازی پوری کے کلام کے بھی ہم دونوں (فراق ومجنوں) عاشق تھے، جسے لذت لے لے کر ایک دوسرے کو سناتے تھے اور جس پر دونوں مل کر تبصرے کیا کرتے تھے-کئی برس بعد ایسا ہوا کہ میں کان پور سناتن دھرم کالج میں پروفیسر ہوگیا اور مجنوں جواب بی اے پاس کر چکے تھے، گورکھ پور ہی میں تھے- ہم دونوں کے شعور اور وجدان کے باہمی ربط کا یہ کرشمہ تھا کہ بغیر ایک دوسرے کی خبر رکھے ہوئے ہم دونوں نے پچاس رباعیاں کہہ ڈالیں اور دونوں نے ایک دوسرے کو خط لکھا کہ آسی کی رباعیوں سے متاثر ہو کر یہ رباعیاں کہی گئی ہیں، ہم دونوں اب تک اس حسن اتفاق پر حیرت کرتے ہیں-'' (نقوش لاہور، شخصیات نمبر ص:۲۹۶)

مجاہد آزادی عارف ہسوی

حضرت آسی کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو مذاق سلیم کسی غزل میں تلاش کرتا ہے-انداز بیان کی متانت وسنجیدگی، مضامین کا علو، خیالات کی بلندی، جذبات کی پاکیزگی ولطافت ان کے کلام کے مخصوص عناصر ہیں اور یہی وہ خوبیاں ہیں جو ان کے کلام کو نیرنگی واعتبار کے بلند درجے پر پہنچا دیتی ہے-ایک خاص خوبی حضرت آسی کے کلام کی یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں بھرتی کے شعر بالکل نہیں ہوتے اور سوقیت وعامیانہ مذاق سے ان کا کلام بالکل پاک ہے، نیز جرأت وداغ کی طرح ہوسنا کی سفاہت بھی ان کے ہاں نہیں پائی جاتی-آسی ایک صاحب حال، صاحب دل اور صاحب نسبت بزرگ تھے-اس لیے فطرتاً ان کا کلام تصوف کی چاشنی سے معمور ہے-وہ کبھی تو ایسے صوفیانہ اشارات کر جاتے ہیں جس سے کلام کی رنگینی ورعنائی حد درجہ دل پذیری کی نشانی اختیار کر لیتی ہے اور کبھی کسی مسئلۂ تصوف پر شاعرانہ رنگ میں روشنی ڈال جاتے ہیں اور مجاز کے پردے میں رموز وحقائق کی طلسم کشائی کر جاتے ہیں، چوں کہ تصوف میں بھی حضرت آسی کا مذاق وحدۃ الوجود کا ہے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس مسئلے پر وہ مختلف والہانہ اور مستانہ انداز میں اپنے واردات قلب قالب شعر میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں جن کے سننے کے ساتھ ہی مذاق سلیم پہروں سر دھنتا رہتا ہے-مجموعی حیثیت سے آسی کا دیوان سدا بہار پھولوں کا ایک ایسا گلدستہ ہے، جس کی عطر بیزی مشام جاں کو معطر کرتی رہتی ہے-

مولانا عبد المجید کاتب مصطفی آبادی

حضرت مولانا کی قدر شمشاد سے پوچھنی چاہیے، یہ حضرت ہی کے فیض کا جلوہ ہے کہ نامی اساتذہ میر، داغ، جلال کے طبقے میں آپ کا شمار کیا جاتا ہے اور قواعد کی پابندی، فن کی واقفیت اور شاگردوں کی کثرت کے لحاظ سے آپ کو ناسخ وقت کہنا بے جا نہ ہوگا-حضرت آسی کا کلام مجاز کے

پردے میں حقیقت کا جلوہ دکھاتا ہے- تصوف میں سر سے پاؤں تک ڈوبا ہوا نظر آتا ہے، وحدت الوجود کا اہم مسئلہ ایسی صفائی اور خوبی سے اکثر جگہ حل کر دیا ہے کہ باید وشاید طبیعت کی شوخی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ایک رند کا کلام ہے، لیکن تعمق نظر سے اگر دیکھیے تو ہر شعر میں ایک تہہ نکلتی ہے اور ہر مجاز میں ایک حقیقت- (سمات الاخیار، ص: ۱۸۸)

مجنوں گورکھپوری

آسی نے زبان، تشبیہات واستعارات اور دیگر رعایات وہی استعمال کیے ہیں جو روز ازل سے ہمارے اردو شعرا استعمال کرتے چلے آئے ہیں؛ لیکن انھوں نے ان روایات قدیمہ میں جو نئی جان ڈالی ہے، اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی- جو تاثیر آسی نے اپنے کلام میں ان رسوم وتکلفات سے پیدا کی ہے وہ انتہائے خلوص وسادگی کے باوجود بھی کسی دوسرے کو مشکل ہی سے میسر ہو سکتی تھی، مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں ہیں کہ آسی دبستان ناسخ کے میر ہیں، خود ان کو بھی اس کا احساس ہے مگر آخر اس تاثیر کا راز کیا ہے، آسی کی باتیں اس قدر درد سے لبریز کیوں ہوتی ہیں اور وہ ہم پر چھا کیوں جاتی ہیں؟

مشرق کے شاعروں میں صرف دو ہستیاں ایسی نظر آتی ہیں، جنھوں نے مجاز کی حقیقت اور قدسیت کو کما حقہ تسلیم کیا ہے اور جن کے مسلک کو مجازیت کہا جا سکتا ہے- ایک تو حافظ دوسرا آسی- درد (خواجہ میر درد) کے تصوف کی دھوم محض تاریخ شعراے اردو کی ایک رسم ہے- وہ خود کتنے ہی زبردست صوفی کیوں نہ رہے ہوں؛ لیکن شاعری میں ان کا شعور عشق بہت ادنیٰ سطح پر ہے اور وہ معاملہ عشق میں محض ایک نوآموز معلوم ہوتے ہیں- آتش میں تصوف اور تغزل دونوں کے قوی اور شدید امکانات موجود تھے، لیکن زمانہ اور ماحول نے تو ان کی تصوف کو اچھی طرح نمایاں ہونے دیا نہ تغزل کو- آسی کے وہاں تصوف اور تغزل حقیقت اور مجاز دونوں ایک مزاج ہو کر نمایاں ہوتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حقیقت والے اس کو حقیقت سمجھتے ہیں اور مجاز والے مجاز- (نکات مجنوں ص: ۵۲، ۱۵۱)

امیر احمد فاروقی کراچوی

حضرت آسی کی شاعری بہ لحاظ زبان وطرز نگارش دبستان لکھنو کی ترجمان ہے اور طرز فکر دہلی اسکول کی، مگر اس کے ساتھ ساتھ حضرت آسی کا رنگ نمایاں ہے، اگر اس دور کے بیشتر اساتذہ کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو دماغی تعیش کے علاوہ خلوص ومحبت اور جذبات واحساسات کا نام ونشان نہیں ملتا اور سب سے نمایاں بات کلام میں ناہمواری ملتی ہے- اس کے برخلاف حضرت آسی نے عرفان اور فلسفۂ تصوف کے لطیف اور نازک مسائل، حقیقت روح، وجود باری تعالی، قدوم وحدوث، جبر واختیار، خیر وشر، وجود وعدم، فنا وبقا، وجود وشہود، جزو کل، تخلیق کائنات کے مقاصد، زیست انسانی کی حقیقت، آدمیت کا مفہوم، حقوق اللہ، حقوق العباد کو قالب شعر میں ڈھالا ہے، بے ہودہ مضامین سے کبھی قلم کو آلودہ نہیں کیا-

حضرت آسی سے بہت پہلے اردو شاعری میں ان نازک مسائل پر خواجہ میر درد نے قلم اٹھایا ہے مگر میر درد کی صوفیانہ شاعری میں قنوطیت کا اثر زیادہ نمایاں ہے- خواجہ میر درد نے تصوف کے مسائل کے اظہار کے لیے غزل سے زیادہ رباعی کا سہارا لیا، اس کے برعکس حضرت آسی کے کلام میں بھرپور تصوف کے مسائل کو حل کیا گیا ہے- ان کے اشعار سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وصال الہی سے ہم کنار ہونے کی جو لذت یا کیفیت حاصل ہوئی اس سے پوری طرح پر محظوظ ہو گیا ہے- متذکرہ بالا مسائل کے سلسلے میں جو انکشافات یا واردات ہوتے ہیں، اس کو صاف صاف بیان کیا ہے اور ساتھ ساتھ بیان میں سادگی الفاظ کا انتخاب اور قادر الکلامی بھی موجود ہے اور خواجہ میر درد اس مقام پر قاصر نظر آتے ہیں- ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس کام کو خواجہ میر درد نے نہیں کیا، اس کو حضرت آسی نے انجام دیا-'' (عظمت آسی، کراچی، ۱۹۶۷ء)

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

''ڈاکٹر صاحب (سید محمود مرحوم، سابق وزیر خارجہ حکومت ہند) کو جون پور کی خانقاہ رشیدیہ سے بھی بڑا گہرا روحانی تعلق تھا، یہ تو یقینی طور پر معلوم نہیں کہ وہ اس سلسلے میں بیعت بھی تھے؛ لیکن ان کو اسی سلسلے کے مشہور شیخ مولانا عبد العلیم آسی غازی پوری سے ایسی عقیدت و وابستگی تھی کہ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ اپنی نوجوانی میں ان سے بیعت ہو گئے تھے، اپنی زندگی کے آخری دور میں وہ ان کا کلام بڑے شغف اور جوش عقیدت کے

ساتھ پڑھتے تھے اور اکثر ان کا تذکرہ فرماتے تھے-" (پرانے چراغ کراچی، ص: ۳۸۴، ۱۹۷۵ء)

مولانا عبد السلام ندوی

"متاخرین کے دور میں شاہ محمد اکبر ابوالعلائی اور شاہ عبدالعلیم آسی نے خصوصیت کے ساتھ صوفیانہ رنگ کو اختیار کیا-"
(شعرالہند، جلد: دوم، ص: ۲۱۶)

خلیل الرحمن اعظمی

"آسی غازی پوری کے یہاں تغزل کی ایسی چاشنی ہے کہ ان کا صوفیانہ کلام بھی مجازی عشق اور جمالیاتی کیفیت میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے-"
(مقدمۂ کلام آتش، ص: ۱۴۳)

ڈاکٹر اعجاز حسین

"اردو شاعری میں تصوف روز ازل سے دخیل ہے، قلی قطب شاہ سے لے کر دور جدید کے پہلے تک قریب قریب ہر شاعر کے یہاں یہ عنصر ملتا ہے، یہ صحیح ہے کہ اکثر و بیشتر شعرا فی نفسہ صوفی معنی نہ تھے، جس میں خواجہ میر درد یا آسی غازی پوری-" (انتخاب کلام آتش ص: ۲۲)

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

"تصوف کا مسلک سودا، سوز، میر حسن، ذوق اور غالب وغیرہ کے یہاں ان کی زندگی نہیں ان کی شاعری ہے، البتہ شاہ محمد اکبر ابوالعلائی اور شاہ عبدالعلیم آسی کے یہاں یہ رنگ اصلیت کے ساتھ ہے-" (دلی کا دبستان شاعری، ص: ۳۱۸)

نازش سکندر پوری

"اردو کا بالغ نظر اور سخن شناس طبقہ تصوف اور تغزل کے منفرد اور صاحب طرز شاعر آسی سکندر پوری کی تہ دار شخصیت اور فن پر برائے نام روشنی ڈالی گئی ہے-اس میں کلام نہیں کہ اردو کا بالغ نظر اور سخن شناس طبقہ آسی کی شاعرانہ عظمت کا معترف ہے، فراق گورکھ پوری جیسا خود پسند شاعر شعر و سخن کی ہر محفل اور اپنی ادبی تحریروں میں آسی سکندر پوری کو خراج عقیدت پیش کرتا نظر آتا ہے، ایسے باکمال شاعر کے فنی پہلوؤں پر کام ہونا چاہیے تاکہ اردو ادب کے شیدائی اردو کے ایک محسن کی قدر و قیمت جان سکیں، وزارت تعلیم سے بھی گزارش کی جاتی ہے کہ آسی جیسے قادر الکلام شاعر کی تخلیقات جو اتقا، پاکیزگی اور پند و نصائح پر مبنی ہیں، تعلیمی نصاب میں داخل کی جائیں-" (سکندر پور کی ادبی تاریخ، ص: ۲۳)

ڈاکٹر محمود الٰہی

حضرت آسی کا شمار ان صوفیوں اور سجادہ نشینوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو شعر و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دیں، ہر چند شاعری میں ان کا سلسلہ ناسخ سے ملتا ہے؛ لیکن انہوں نے ہمیشہ شاعری کے منصب و مقصد کو پیش نظر رکھا اور شعر کو لفظی بازی گری کا نمونہ نہیں بننے دیا، تصوف نے ان کے رنگ تغزل کو پاکیزگی اور ہر دل عزیزی عطا کی، صوفیانہ غزل کی تاریخ میں حضرت آسی کی خدمات کو ہمیشہ نمایاں جگہ ملے گی-"
(انتخاب کلام آسی غازی پوری، اردو اکیڈمی لکھنؤ، ۱۹۸۳ء)

ڈاکٹر ساحل احمد دہلوی

دراصل ان کے کلام کی جس خوبی خاص نے تاثیر کو اجاگر کیا، وہ ان کی عارفانہ فکر ہے-اسی نے مسائل تصوف اور اس کے رموز و نکات کو بحسن وخوبی اجالنے کی کوشش کی اور ایسے اشعار تخلیق کیے جن میں حسن معرفت اور طریق بندگی کے اسرار ثبت ہیں- اسی لیے ان کے شعروں میں ایک طرح کی روحانیت، خوشبوئے راستی، اصول حیات اور واردات کشفیہ کے زاویے موجود و مستور ہیں- آسی یقینی طور پر تصوف کے مسائل و معاملات سے آگاہ ایک باخبر سالک تھے- بہ قول مولانا خیر بہوروی "آسی کا دیوان ان کے عارفانہ اور حکیمانہ کلام کی انجیل ہے-" اور یہ آسی کی شعری ادراکیت تھی جس کی وجہ سے غزل کی غزلیت اور صوفی کی صوفیت باہم مدغم ہو کر ایک اور ہی کیفیت اختیار کر گئی ہے، جسے دوآتشائی احساس کہہ سکتے ہیں- یہ ان کا عملی ادراک ہے جس کی وجہ سے شعریت بولتی بھی ہے اور پردہ بھی کرتی ہے- لیکن اس پردہ کرنے میں بھی شعریت کا باب جمالی ہمہ تن

موجود ہے- غرض کہ ان کی یہ باوصف شاعری خزانۂ غزل کا قیمتی حصہ ہے جس پر مزید غور و فکر کی اور مطالعے کی ضرورت ہے-''
(خیر خواہان جہان علم و زبان، جلد: اول ۲۴، ۲۵، ۲۶)

ڈاکٹر طیب ابدالی اسلام پوری

''حضرت آسی کے کلام میں جذبات عشق کی پاکیزگی اور سوز و گداز کی جو طہارت ملتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ عشق حقیقی میں فنا ہوکر مجسم سوز و گداز بن گئے تھے- آسی کی شاعری میں تصوف کی چاشنی بھی ہے اور تغزل کا سوز و گداز بھی، ان دونوں نے مل کر ان کی غزلوں کو دو آتشہ بنا دیا ہے- انہیں دبستانِ ناسخ کا میر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا- اس لیے کہ میر کا رنگ و آہنگ اور حافظ شیرازی کا صوفیانہ مذاق ان کا طرۂ امتیاز ہے- آسی کا کلام تصوف کے رموز و نکات سے مزین ہے- ان کے اشعار میں جو والہانہ پن ہے وہ اُردو کے صوفی شاعروں میں خال خال نظر آتا ہے- خواجہ درد، مرزا مظہر جان جاناں، آتش، غالب وغیرہم کے یہاں تصوف ایک حد تک روایتی نظر آتا ہے، لیکن آسی کے یہاں بصیرت اور کیفیت کی ایسی ہم آہنگی ہے کہ قاری کیف آگیں ہو جاتا ہے-(انتخاب کلام آسی غازی پوری، ص:۹، ۱۰)

مولانا خیر بھوروی

''آسی کا دیوان ان کے عارفانہ اور حکیمانہ کلام کی انجیل ہے-'' (آسی سکندر پوری، شاعر، اگست ۱۹۷۱ء)

پروفیسر عبیدالرحمن صدیقی

انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ضلع غازی پور سے مشرقی شمال ضلع بلیا کی تحصیل سکندر پور واقع ہے، وہاں کے ایک مکارم اخلاق کے آفتاب، حکیم و فلسفی اور عبقری شخصیت حضرت ظہور الحق محمد عبدالعلیم آسی علیہ الرحمہ نے شہر غازی پور کے محلّہ نور الدین پورہ کو اپنی منزل قرار دیا- آپ کے زمانے میں اس علاقے کو بڑا فروغ ہوا، سرکاری عہدیداران سے لے کر علما و فضلا تک آپ کے قدرداں تھے- یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس گو ہر شب نے غازی پور کو اپنی مشیخت و روحانیت کا مرکز قرار دے کر غازی پور کو سرزمین رشید یہ بنا دیا- طبیعت کے اعتبار سے آپ میں سنجیدگی حد سے زیادہ تھی، آپ نے ہمیشہ اپنی بزرگی کو چھپائے رکھا اور دل میں خیال رہتا کہ کسی کو پتہ نہ چل جائے- مشیت ایزدی نے حضرت آسی کی شخصیت کو صرف ایک چھوٹے سے گھرانے کے دائرہ تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ خداوند کریم کو بڑے بڑے کام لینے تھے، لہٰذا غم و آلام میں رہتے ہوئے آپ کو آفاق گیر شخصیت کا مالک بنا دیا اور پوری دنیائے انسانیت آپ کا گھرانہ بن گئی اور آپ ساری زندگی مرجع خلائق رہے-(تذکرۂ مشائخ غازی پور، ص: ۴۵۱، ۴۵۳)

بقیہ: حضرت آسی غازی پوری کی نعتیہ شاعری

عبث دردِ عصیاں سے تو کیوں کر رہے
شفا اس مرض سے اگر اپنی چاہے
تو لازم ہے ذکر نبی میں نیا ہے
خوشا منزل و مسجد و خانقاہے
کہ در وے بود قیل و قال محمد ﷺ

حضرت آسی کی تمام نعتوں یا تمام نعتیہ اشعار کا تجزیاتی مطالعہ اس مضمون میں ممکن نہیں ہے، اس کے فکری و فنی جائزے کے لیے ایک دفتر چاہیے- اس لیے میں اپنی گفتگو ان کے اس بے حد مقبول شعر پر تمام کر رہا ہوں جو ضرب المثل کی حیثیت بھی اختیار کر چکا ہے- ہر مداح مصطفیٰ ﷺ اپنی تحریر و تقریر میں بلا تکلف اس کا حوالہ دیتا ہے- اس لیے کہ اس میں جو ایک خاص روحانی لذت و کیفیت ہے اس کا صحیح اندازہ اہل نظر کر سکتے ہیں- ملاحظہ ہو ؂

جو شے تری نگاہ سے گزرے درود پڑھ
ہر جز و کل ہے مظہر انوار مصطفیٰ ﷺ

یعنی کاہ سے کہکشاں تک اور ذرہ سے آفتاب تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت پہ شاہد ہے، اس لیے ہم تمام وفا شعار غلاموں کا یہی وظیفہ ہونا چاہیے کہ آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں زیادہ سے زیادہ ہدیۂ درود بھیجتے رہیں، اسی میں ہماری اُخروی نجات، کامیابی اور سر بلندی کا راز مضمر ہے-

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

☆ سابق صدر: شعبۂ اردو، بہار یونیورسٹی، مظفر پور (بہار)

ابرار احمد مصباحی☆

حضرت شاہ عبدالعلیم آسی غازی پوری: حیات وشخصیت

علم وتصوف کی دنیا میں حضرت شاہ عبدالعلیم آسی غازی پوری کی شخصیت بڑی اہمیت وحیثیت کی حامل ہے، آپ چودہویں صدی ہجری کے نامور عالم وفقیہ، جلیل القدر عارف وصوفی، عظیم المرتبت داعی ومصلح، کامل الفن حکیم وطبیب، قادر الکلام شاعر وسخن ور اور اخلاق و تصوف کے عظیم ترجمان وعلم بردار تھے۔

آپ کا اسم گرامی محمد عبدالعلیم، تاریخی نام ظہور الحق، تخلص آسی، عرف حضرت مولانا وسرکار آسی اور لقب بحرالاسرار قاسم الانوار قطب العرفا والعشاق ہے، آپ مذہباً سنی حنفی، مزاجاً صوفی صافی، مشرباً قادری اور نسباً فاروقی ہیں۔

نسب مبارک: آپ کا پدری نسب نامہ امیر المومنین سیدنا حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے، آپ کے اجداد میں نویں پشت میں حضرت شیخ احمد مبارک چشتی عدنی قدس سرہ (متوفی ۱۰۱۶ھ) سلسلہ چشت کے ایک اہم بزرگ گزرے ہیں جو ایک بلند پایہ عالم و عارف تھے اور حضرت مولانا شاہ مظفر بلخی قدس سرہٗ کی اولاد امجاد میں سے تھے، یہ ملک عرب کے عدن سے ہجرت فرما کر ارض ہند کے قصبہ سکندر پور ضلع بلیا فروکش ہوئے اور شریعت وطریقت کی تعلیم واشاعت کا سلسلہ قائم کیے اور بیش بہا علمی وروحانی خدمات انجام دے کر یہیں مدفون بھی ہوئے۔

ولادت و پیدائش: آپ کی ولادت ضلع بلیا یوپی کی زرخیز بستی سکندر پور میں ۱۹؍شعبان المعظم ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۲ء میں ہوئی، آپ کے والد بزرگوار حضرت شیخ قنبر حسین رشیدی قدس سرہ (متوفی ۱۲۸۰ھ) تھے جو ایک درویش کامل اور باکمال بزرگ تھے اور قطب العالمین حضرت شاہ امیر الدین رشیدی قدس سرہ (متوفی ۱۲۶۵) کے مرید وخلیفہ اور آپ کے پیرومرشد کے برادر طریقت تھے۔

پرورش و پرداخت: آپ کا ننھیال قاضی پورہ ضلع آرہ بہار تھا، آپ کی والدہ ماجدہ حضرت مفتی احسان علی آروی قدس سرہ کی پوتی تھیں جو حضرت شاہ غلام حیدر بلیاوی کے خلیفۂ اکمل تھے، عالم صغر سنی ہی میں والدہ ماجدہ آپ کو داغ مفارقت دے کر عالم جاودانی میں داخل ہوگئیں اور آپ شفقت مادری سے محروم ہوگئے، نانی صاحبہ آپ کو اپنے ہمراہ آرہ (بہار) لے آئیں اور یہیں بڑے ناز ونعم اور انتہائی شفقت ومحبت کے ساتھ پرورش وکفالت فرمائیں۔

تعلیم وتربیت: آپ فطری طور پر انتہائی ذہین وفطین تھے، خدائے تعالیٰ نے بلا کی ذکاوت وذہانت آپ کے اندر ودیعت فرمائی تھی، ’’قوت حافظہ کا یہ عالم تھا کہ کوئی کتاب ایک مرتبہ پڑھ جاتے تو وہ حفظ ہوجاتی اور ابتدائی کتابیں تو آپ نے محض دوسروں کو پڑھتے ہوئے سن کر ہی یاد کر لی تھیں۔‘‘ (۱) آپ اپنی ابتدائی تعلیم یعنی فارسی وعربی کی کچھ کتابیں اپنے نانا حضرت مفتی احسان علی قاضی پوری قدس سرہ سے پڑھتے ہوئے قطب الاقطاب حضرت شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری قدس سرہ (متوفی ۱۰۸۳ھ) کے مئے کدہ علم ومعرفت میں حاضر ہوئے اور یہاں آستانہ عالیہ رشیدیہ اور مدرسہ رشیدیہ میں رہ کر اس سلسلہ و خانقاہ کے جامع کمالات بزرگ اور شیخ طریقت قطب الہند حضرت شیخ غلام معین الدین رشیدی جون پوری قدس سرہ (متوفی ۱۳۰۷ھ) سے تعلیم شریعت و طریقت حاصل کیے، اس کے بعد حضرت مولانا سخاوت علی جون پوری کی تحریک پر قائم کردہ ادارہ ’’مدرسہ حنفیہ‘‘ جون پور میں مشہور عالم وفاضل حضرت مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنوی قدس سرہٗ کی خدمت میں پہنچے اور ان سے علوم معقولات ومنقولات کی تمام کتابیں پڑھیں، اس کے بعد جب یہ اپنے وطن فرنگی محل لکھنؤ واپس چلے گئے اور ان کی جگہ پہ حضرت مفتی یوسف فرنگی محلی قدس سرہ تشریف لائے تو ان سے بھی آپ نے استفادہ فرمایا۔

اساتذۂ کرام: آپ کے اساتذہ میں پیرومرشد حضرت قطب الہند، نانا حضرت مفتی احسان علی قاضی پوری، علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنوی، حضرت مفتی محمد یوسف فرنگی محلی لکھنوی جیسے نامور علما وفضلا اور مصنفین و محققین شامل ہیں۔

اساتذہ کو شاگرد پر ناز: آپ اپنے اساتذہ کے ہمیشہ محبوب نظر

رہے؛ بلکہ ان حضرات کو آپ کی کمال ذکاوت اور اپنے شاگرد پر بڑا فخر و ناز تھا، آپ کے فہم رسا اور ذہنی استعداد پر سب حیران اور رطب اللسان تھے- چناں چہ جب علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی تدریس کے لیے مدرسہ حنفیہ میں تشریف لائے اور آپ کی شہرت سن کر اِدھر اُدھر سے طلبہ کثرت سے جمع ہونے لگے تو آپ بھی ان کی خدمت میں پہنچے" مگر جو کتاب آپ پڑھتے تھے، وہاں نہ ہوتی تھی، آپ نے یہ ترکیب نکالی کہ ملا جلال کے پڑھنے والوں کے ساتھ بیٹھ کر سماعت فرمانے لگے، کئی روز کے بعد ایک دن مولانا نے اجنبی آدمی دیکھ کر پوچھا کہ تم کون ہو، کیا پڑھتے ہو؟، آپ نے اپنا نام بتایا اور قطبی کا نام لیا- مولانا نے فرمایا کہ قطبی تو پڑھتے ہو اور ملاحسن چھوڑ کر کے ملا جلال سنتے ہو، کچھ سمجھتے بھی ہو؟ آپ نے فرمایا کہ سبق کے متعلق آپ پوچھ لیں- مولانا نے مطلب پوچھا، آپ نے نہایت شرح وبسط کے ساتھ تقریر کی، مولانا بہت خوش ہوئے اور ملاحسن کا سبق اپنے یہاں مقرر فرمایا-(۲) آپ کے سبق میں ردوقدح کی وجہ سے گھنٹوں گزر جاتے تھے،" نصف سطر اور ایک سطر کے سبق میں چھ سات گھنٹے صرف ہوتے تھے، استاد شاگرد دونوں پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے، نصف صفحہ ایک صفحہ کے بعد مولوی عبدالحلیم صاحب قدس سرہ کتاب بند کرا دیتے اور فرماتے کہ اب کتاب ختم ہوگئی دوسروں کو پڑھاؤ مگر حضرت خود کتاب کا مطالعہ کر کے ختم کر لیتے،" (۳) مولوی وکیل احمد صاحب سکندر پوری بھی جو حضرت کے چچا زاد بھائی تھے اور حیدر آباد دکن میں جج تھے، مولوی عبدالحلیم صاحب سے پڑھتے تھے، وہ جب کوئی اعتراض کرتے تھے تو مولوی عبدالحلیم صاحب غور وفکر کے بعد اس کا شافی جواب دے دیتے تھے، مگر جب حضرت ڈوب کر کوئی اعتراض کرتے تھے تو مولوی عبدالحلیم صاحب دو دو ہفتہ غور وفکر کے بعد کوئی کمزور سا جواب دیتے تو حضرت فرماتے کہ" حضرت آپ استاد ہیں کہیے تو مان لوں مگر میرے اعتراض کا جواب نہ ہوا-" مولوی عبدالحلیم صاحب فرماتے کہ" کہتے تو صحیح ہو جواب نہیں ہوا، اب تم خود اپنے اعتراض کا جواب دو!" اس کے بعد حضرت خود اپنے اعتراض کا جواب دیتے تو مولوی عبدالحلیم صاحب خوشی سے پھولے نہ سماتے" (۴)،" جب مدرسہ حنفیہ جون پور سے مولوی عبدالحلیم صاحب لکھنؤ چلے گئے اور ان کی جگہ یہ حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحب تشریف لائے تو حضرت (آسی) ہدایہ پڑھنے کے لیے مفتی صاحب کے پاس تشریف لے گئے، مفتی صاحب نے فرمایا کہ فقیر کا معمول شمس بازغہ کے بعد ہدایہ پڑھانے کا ہے- حضرت نے فرمایا کہ میں شمس بازغہ پڑھ چکا ہوں، مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مثل عامی شاگردوں کے پڑھانا چاہا، حضرت نے فرمایا کہ میں تین سطروں کا مطالعہ کر کے آیا ہوں، میں نے جو باتیں ان تین سطروں میں پیدا کی ہیں، اس کو سن لیجیے- حضرت نے تین گھنٹے تک ان تین سطروں پر تقریر کی- مفتی صاحب دم بخود سنتے رہے، جب حضرت تقریر ختم کر چکے تو مفتی صاحب نے فرمایا کہ صاحبزادے! میں آپ کی ذہانت کی تعریف مولوی عبدالحلیم صاحب سے سن چکا ہوں- جب مجھے ایسے شاگرد کی تلاش تھی تو کوئی ملا نہیں، اب ضعیف ہو چکا ہوں، آپ کے پڑھانے کے لائق نہیں رہا اور آپ کو اس کی حاجت بھی نہیں ہے خود کتاب دیکھ جائیے اور دوسروں کو پڑھائیے-(۵)"

ذوق مطالعہ: آپ کے اندر کتب بینی اور مطالعے کا شوق وذوق حد درجہ تھا، انہماک واستغراق کا یہ عالم کہ کتابوں کے علاوہ آپ کی توجہ کہیں جاتی ہی نہ تھی" ایک بار محلّہ میں کسی حلوائی کی دکان پر مطالعہ کے لیے کتاب لے کر بیٹھ گئے- اس سڑک سے ایک دھوم دھام بارات گزر گئی اور خبر نہ ہوئی- فجر کی آذان پر چونکے کہ صبح ہوگئی" (۶)، استعداد بڑھانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ مطالعہ کے وقت پہلے شرح و حاشیہ پر نظر نہیں ڈالتے تھے، متن سے غور وخوض کر کے مطالب و اعتراضات وجوابات کی ترتیب دے لیتے تھے، تب حواشی وشروح پر نظر اٹھاتے تھے- اگر اپنے اعتراض وجواب کو لکھا ہوا پاتے تھے تو بہت خوش ہوتے تھے- بڑے بڑے منتہی طلبہ آپ سے شوقیہ پڑھتے تھے" (۷)، رات کی رات مطالعے میں گزر جاتی تھی، مطالعے میں نئے مطالب پیدا کرتے تھے اور اعتراضوں کے جواب نکالتے تھے اور جو جواب کتاب میں لکھے ہوئے ہوتے تھے، ان پر اعتراض پیدا کر کے ان کو بگاڑتے تھے-(۸)"

عقد مسنون: آپ کی شادی غازی پور کے محلّہ نورالدین پورہ میں منشی راحت علی غازی پوری کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی-

ولا دامجاد: آپ کی صرف تین صاحبزادیاں ہی تھیں-

درس وتدریس: آپ جب علوم وفنون کی تحصیل سے فارغ ہوئے تو اب درس وتدریس میں مشغول ہوئے اور مدرسہ رشیدیہ جون پور کے

طلبہ کو درس دینے لگے-"تدریس کے وقت کتاب آپ کے سامنے نہ ہوتی بلکہ اسی طرح زبانی لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے، خانقاہ رشیدیہ جون پور کا مدرسہ آپ ہی کے زیر اہتمام تھا، آپ جو ایک بار پڑھا دیتے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذہن نشیں ہو جاتا، پڑھانے کا طریقہ ایسا جاذب تھا کہ ایک بار حضرت سے درس لینے کے بعد کوئی لڑکا کسی دوسرے استاد کی طرف رجوع نہ ہوتا، یہاں تک کہ حکیم سید جعفر حسین کاشف لکھنوی جب کچھ دنوں کے لیے لکھنؤ جانے لگے تو اپنے شاگردوں کو حضرت کے سپرد کر گئے کہ ان کو طب پڑھا دیجیے، حضرت فرماتے تھے کہ میں شب کو مطالعہ کیا کرتا تھا اور صبح کو درس دیا کرتا تھا- جب حکیم صاحب واپس آئے تو کوئی شاگرد ان کے پاس جانے کو تیار نہیں ہوا-(۹)"

تلامذہ: آپ کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہے، آپ کے درس و تدریس کا شہرہ ملک میں پھیلا ہوا تھا، مختلف خطوں سے طالبان علوم دینیہ آتے اور آپ کی بافیض درس گاہ سے گوہر مقصود حاصل کر کے جاتے- آپ کے حلقۂ تلامذہ میں سید شاہ بشیر اجملی الہ آبادی (سجادہ نشیں دائرۂ شاہ اجمل الہ آباد) مولانا شاہ سراج الدین رشیدی (سجادہ نشیں خانقاہ رشیدیہ جون پور)، سید شاہ شاہد علی علیمی فانؔی گورکھ پوری (سجادہ نشیں خانقاہ رشیدیہ جون پور)، مولانا عبدالمجید کاتبؔ مصطفیٰ آبادی، مولانا سید محمد شاد غازی پوری مولانا علی گوہر پھلواروی، مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی، فدائؔی جون پوری، مولانا محمد صدیق سکندر پوری، مولانا احمد حسین لبیبؔ سکندر پوری، مولانا محمد احمد ایمنؔ سکندر پوری، حکیم شاہ فریدالدین احمد فرید، شاہ معین الدین حسن معیؔن، شاہ محی الدین حسن حیات غازی پوری، شاہ شہاب الدین عمر احمد شہاب غازی پوری، مولانا عبدالصمد صمد غازی پوری، شیخ محمد حسین باقؔی غازی پوری وغیرہ نامور علما و مشائخ اور باکمال شعرا ادبا قابل ذکر ہیں-

طلبہ واساتذہ کے لیے ایک قابل تقلید اور نمونۂ عمل قول زریں: آج کے مدارس وجامعات میں مسند درس وتدریس پہ فائز ہونے والے اساتذہ اور ان کی صحبت میں تعلیم وتربیت حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے آپ نے ایک دستور العمل کے طور پر ارشاد فرمایا ہے جو یقیناً قابل تقلید اور نمونۂ عمل ہے: "جس نے علوم عربیہ پڑھیں اور اس قابل نہ ہوا کہ دوسروں کو طب پڑھا سکے تو اس نے خاک نہیں پڑھا-(۱۰)"

مذکورہ قول زریں اپنے اندر بے پناہ جامعیت ومعنویت رکھتا ہے، یہ جہاں طلبہ کے اندر علمی گہرائی وگیرائی اور فنی صلاحیت ولیاقت پیدا کرنے کی دعوت دیتا ہے، وہیں علوم دینیہ وعربیہ کی اہمیت وافادیت کو بخوبی واضح کرتا ہے-

طبابت میں کمال اور حیرت انگیز تشخیص: آپ کی خداداد صلاحیت، انتہائی ذکاوت اور کمال بصیرت کا ہی نتیجہ ہے کہ محض علم طب کی کتابوں کے مطالعے سے ہی اتنی زبردست استعداد اور معلومات بہم پہنچائی کہ ایک کہنہ تجربہ کار اور ماہر حکیم کی طرح مطب چلانے لگے جب کہ آپ نے طب کا ایک حرف بھی کسی استاد سے نہیں پڑھا اور نہ ہی کبھی کسی مطب میں بیٹھے- آپ کی تشخیص اعلیٰ پایے کی ہوتی تھی، قلم سے جو نسخہ نکلتا تھا تیر بہدف ثابت ہوتا تھا اور شفا کا یہ حال کہ جو مریض بھی آتا وہ بامراد اور کامیاب ہو کر واپس ہوتے-"آپ کی طبابت کا یہ حال تھا کہ بارہ سو پندرہ سو آدمیوں کا مجمع مطب میں جمع ہوا کرتا تھا، اشراق کے بعد مطب میں بیٹھا کرتے تھے اور ظہر کے وقت فرصت ملتی تھی- دونوں ہاتھوں سے نبض دیکھتے جاتے تھے اور چار چار کاتب نسخہ لکھتے جاتے تھے- ہندوستان بھر سے جو مریض مایوس ہو کر آپ کے پاس آتے تھے چند روز ہی میں شفایاب ہو کے خوشی خوشی واپس جاتے تھے- یہ بھی خصوصیت تھی کہ حضرت (آسی) فیس نہیں لیتے تھے-(۱۱)"

بیعت وارادت: آپ خانقاہ عالیہ رشیدیہ کے چھٹویں سجادہ نشیں قطب الہند حضرت شاہ غلام معین الدین رشیدی (متوفی ۱۳۰۷ھ) کے دست حق پرست پر سلسلۂ عالیہ قادریہ احمدیہ میں بیعت وارادت سے مشرف ہوئے اور حضرت قطب الاقطاب جون پوری قدس سرہ کے چشمۂ علم ومعرفت سے خوب سیراب ہوئے-

خلافت واجازت: اپنے پیر ومرشد قطب الہند حضرت شاہ غلام معین الدین رشیدی قدس سرہ سے ہی خلافت واجازت کی دولت حاصل ہے-

شیخ کامل حضرت قطب الہند کا اجمالی تعارف: آپ ایک عالم کامل، زاہد مرتاض، مرشد برحق اور سلسلۂ رشیدیہ جون پور کے چھٹویں سجادہ نشیں تھے، بیعت وخلافت اپنے والد ماجد حضرت قیام الحق حضرت شاہ شاہ امیر الدین رشیدی قدس سرہ (متوفی ۱۲۶۵ھ) سے حاصل تھی جلال وجمال کے حسین سنگم تھے، اوصاف حمیدہ اور اخلاق فاضلہ کے جامع تھے، طبیعت میں نظافت ونفاست غالب تھی، غربا وفقرا پہ حد درجہ

مہربانی فرماتے اور حاجت مندوں اور عاجزوں کی خبر گیری و حاجت روائی فرماتے، آپ کے کشف وکرامات بے شمار ہیں، ولادت جون پور میں ہوئی، دینی علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل حضرت مولانا محمد شکور مچھلی شہری قدس سرہما متوفی ۱۲۰۰ھ (تلمیذ رشید حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی وعلامہ فضل امام خیرآبادی) اور حضرت مولانا معشوق علی حنفی جون پوری قدس سرہما (متوفی ۱۲۶۸ھ) جیسے نامور علما وفضلا سے کی-''اس کے بعد حسب دستور خاندان آخر عمر تک برابر درس دیتے رہے اور طالبان علوم مستفیض ہوتے رہے، آپ کے یہاں ہمیشہ سے طلبہ کے سبق وطبق دونوں کی کفالت ہوتی-اس خانقاہ کی دال روٹی شاہی نعمتوں پر بھی بھاری تھی، اس آستانہ سے جو پڑھ کے گیا وہ دینی ودنیاوی فلاح سے محروم نہ رہا(۱۲)'' آپ کی شادی اپنے حقیقی ماموں قاضی واجد علی نظام آبادی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جن سے کوئی اولاد نہ تھی، آپ اپنے مشائخ کرام اور پیران سلاسل کے نقوش قدم پہ چلتے ہوئے تا حیات درس تدریس، اخلاق ومحبت، رشد وہدایت، خدمت انسانیت اور سلسلہ رشیدیہ جون پور کی تعمیر وتوسیع کے فرائض انجام دے کر ۱۳۰۷ھ میں مالک حقیقی سے جا ملے، مزار مبارک خانقاہ حیدری (تکیہ حیدری) بھہن برہ ضلع سیوان بہار میں واقع ہے-

مسند سجادگی: حضرت آسی نے اپنے مرشد گرامی کی خدمت میں سترہ یا اٹھارہ سال کی عمر سے پچاس کی عمر تک ایک طویل مدت گزاردی اور اذکار واشغال کی تمام منزلیں طے فرمائیں اور مرشد کامل کی طرف سے جمیع سلاسل کی خلافت واجازت بھی حاصل ہوئی، لیکن اس کے باوجود آپ نے کسی کو مرید نہیں کیا؛ لیکن چوں کہ آپ ظاہر وباطن اور اصلاح وتزکیہ کے اعتبار سے حضرت قطب الہند کے تراشیدہ وتربیت یافتہ تھے اور آپ کی ذات والا صفات علم وفضل، صدق وصفا، اخلاص ووفا، اخلاق وآداب وغیرہ جیسی عمدہ خوبیوں اور جامع صلاحیتوں کی مرصع تھی-لہٰذا آپ اپنی انہی گوناگوں خصوصیات وکمالات کی وجہ سے ۱۳۱۴ھ میں ہندوستان کی علمی وتاریخی قدیم خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور کے آٹھویں صاحب سجادہ کی حیثیت سے منتخب ومقرر ہوئے-

معمولات وروایات کی پابندی: بحث ومباحثے میں کبھی نہ پڑے بلکہ اس سے سخت گریز کرتے، نام ونمود اور شہرت وعزت سے نفور رہے، تواضع وانکساری پر قائم رہے اور دوسروں کو اس کی تعلیم وتلقین کرتے، آپ نے بزرگان دین اور سلاسل طریقت کی زیارت اور ان سے کسب فیض کے لیے دور ودراز مقامات کے سفر کیے، دعوتی وتبلیغی امور کی انجام دہی کے لیے کئی اہم دورے کیے، لوگوں کو ہمیشہ اخلاق وتعلیم اور انسانیت ومحبت کا درس دیا، مریدین کے گھر بن بلائے کبھی نہ جاتے، زندگی بھر فقر وقناعت پر قائم رہے، اپنی ولایت وبزرگی کو طبابت کے پردے میں چھپائے رکھا، اظہار کرامت سے سخت پرہیز کیا، تاحیات درس وتدریس کے فرائض انجام دے کر علوم وفنون کی اشاعت میں حصہ لیا، امانت و دیانت داری سے رشد وہدایت اور خانقاہی امور کو انجام دیا، مریدین و متوسلین کی تربیت وتزکیہ کر کے کمالات سے سرفراز کیا، سلسلہ رُشیدیہ جون پور کی تعمیر وتوسیع کر کے خاطر خواہ اسے ترقی دیا-

سلسلۂ رُشیدیہ کا فروغ: آپ نے علمی ودینی اور اخلاقی وروحانی ہر اعتبار سے سلسلۂ رُشیدیہ کے فروغ میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ اس سلسلے کے نامور بزرگوں اور مشائخ میں آتے ہیں، آپ نے باکمال خلفا ومریدین پیدا کیے جو ملک وبیرون ملک میں جا کر رشد وہدایت کے فرائض انجام دیے اور سلسلۂ رشیدیہ کے دائرہ دعوت وتبلیغ اور رشد وہدایت کو دور دور تک پھیلائے-

ممتاز خلفا: سید شاہ شاہد علی سبز پوش علیمی فانی گورکھ پوری، حکیم سید شاہ عبدالعزیز بہاری، شاہ محمد اویس پھلواری، مولانا سید محمد فاخر بیخود اجملی الہ آبادی، مولانا شاہ صوفی عبداللطیف رشیدی بلیاوی (والد ماجد حضرت علامہ ارشد القادری)، سید شاہ نذیر احمد بہاری، شاہ عبدالحق ظفر آبادی، مولانا شاہ عبدالسبحان گورکھ پوری، شاہ ذاکر حسین قتال پوری، مولانا عبد الرحیم سیوانی، شاہ الفت حسین غازی پوری وغیرہ قابل ذکر ہیں-

ممتاز مریدین: مولانا شاہ سکندر علی علیمی رشیدی پورنوی، مولانا ولی الرحمٰن ولی علیمی پوکھریروی، مولانا سید شاہ عبدالشکور علیمی سیوانی، مولانا یوسف علی علیمی رشیدی پورنوی، مولانا شاہ تفضل حسین علیمی، مولانا شاہ تاج الدین علیمی وغیرہ قابل ذکر ہیں-

تصوف وطریقت کی اشاعت: صوفیہ کا طریقہ ہمیشہ سے رشد و ہدایت، تربیت وتزکیہ، محبت وانسانیت، صبر وقناعت اور خدمت خلق کا رہا ہے، ان کے یہاں انسانیت نوازی اور دل جوئی سے بڑھ کر کوئی ثواب نہیں ہے-آپ چودھویں صدی ہجری میں تصوف وطریقت کے عظیم علم بردار اور متقدمین صوفیہ کے مشن کے بڑے ترجمان تھے، آپ

کی اہم شناخت علم و تصوف کے حوالے سے ہی زیادہ ہے- یہی وجہ ہے کہ آپ ایک عظیم عالم و فقیہ ہونے کے باوجود دنیائے علم و تصوف میں ایک عارف کامل، شیخ وقت اور صوفی شاعر کی حیثیت سے زیادہ متعارف ہیں، اور آپ کے القابات عالیہ بحر الاسرار، قاسم الانوار، قطب العرفا و العشاق اسی کے غماز ہیں- آپ نے زندگی بھر رشد و ہدایت کا اہم فریضہ نبھایا، لوگوں کو اخلاق و محبت کی تعلیم و تلقین کی، حسن سلوک اور خدمت خلق پر کافی زور دیا، خاص طور پر آپ نے تصوف کو قالب شعر و ادب میں ڈھال کر اس کی اہمیت کو اور اجاگر کر دیا ہے اور اپنی صوفیانہ و عارفانہ شاعری کو کمال و تمام تک پہنچا دیا ہے- غرض کہ آپ نے علمی و روحانی صلاحیت، صوفیانہ شاعری، حکمت و مصلحت اور خاموش مزاجی کے ساتھ عملی اور نظری ہر اعتبار سے تصوف کے فروغ میں اہم کارنامہ انجام دیا ہے-

شعر و شاعری: آپ کی خداداد صلاحیت، علمی لیاقت، فنی بصیرت، اخاذ طبیعت اور زبان و بیان پر قدرت نے آپ کو ایک فقید المثال اور قادر الکلام شاعر بنا دیا تھا، شعر و ادب میں کمال و درک حاصل کرنے ساتھ ساتھ اس فن میں آپ نے بڑی یادگار اور قابل قدر چیزیں بھی چھوڑیں ہیں- روایتی انداز میں آپ نے عاصی تخلص اختیار کر کے شعر گوئی شروع کر دی تھی؛ لیکن اپنے شیخ و مرشد کے حکم سے آسی کا تخلص اپنایا اور پھر باقاعدگی سے اس فن میں اپنی علمی و فکری جولانیت کا مظاہرہ کیا- شاعری میں شاگردی کا شرف حضرت شاہ غلام اعظم افضل الہ آبادی قدس سرہ، سجادہ نشیں دائرہ شاہ اجمل الہ آباد (ارشد تلمیذ شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی) سے حاصل ہے-''حضرت آسی نو برس کی عمر میں فارسی پڑھ کر عربی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے، اسی وقت سے آپ کا میلان طبع شعر گوئی کی طرف راغب تھا، چند سالوں کے اندر بے تکلف ایسے اشعار کہنے لگے کہ جب حضرت شاہ غلام اعظم جون پور تشریف لائے تو ان کو اپنا کلام دکھایا، انہوں نے کل ڈھائی غزلیں دیکھ کر انعام میں اپنا خاص مصرفی قلم دان عطا کیا اور فرمایا کہ تمہیں اصلاح کی چنداں ضرورت نہیں (۱۳)'' تاہم آپ ادباً اپنی غزلیں اپنے استاد کی خدمت میں بھیجتے رہتے اور وہ اکثر یہ کہہ کر واپس کر دیتے کہ اب اصلاح کی گنجائش نہیں ہے-

آپ کے کلام مسائل تصوف کے رموز و نکات سے مزین و معمور ہیں، جذبات و خیالات کی پاکیزگی، زبان و بیان کی صفائی اور شعر و ادب کی تمام تر جلوہ سامانیاں موجود ہیں- آپ کی تخلیقات اور اشعار کے مجموعے کو آپ کے مرید و خلیفہ شہود الحق حضرت سید شاہ شاہد علی علیمی سبز پوش فانی گورکھپوری قدس سرہ (متوفی ۱۳۷۲ھ) نویں سجادہ نشیں خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور نے ''عین المعارف'' معروف بہ ''دیوان آسی'' کے نام سے شائع کیا ہے جس کو علمی ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا ہے، اس نے ارباب زبان و ادب اور صاحبان سلوک و معرفت کو حیرت و تعجب میں ڈال دیا ہے-

حضرت آسی کے شہرۂ آفاق اشعار میں سے چند قارئین کی ذوق مطالعہ کی نذر ہیں، ملاحظہ ہو:

نہ میرے دل نہ جگر پر نہ دیدۂ تر پر
کرم کرے وہ نشان قدم تو پتھر پر
تمہارے حسن کی تصویر کوئی کیا کھینچے
نظر ٹھہرتی نہیں عارض منور پر
کسی نے لی رہِ کعبہ کوئی گیا سوئے دَیر
پڑے رہے تیرے بندے مگر تیرے در پر
پلا دے آج کہ مرتے ہیں رندا ے ساقی
ضرور کیا کہ یہ جلسہ ہو حوض کوثر پر
گناہ گار ہوں میں واعظو! تمہیں کیا فکر
میرا معاملہ چھوڑو! شفیع محشر پر
آخیر وقت ہے آسی چلو مدینے کو
نثار ہو کے مرو تربت پیمبر پر

معاصرین کا اعتراف: اپنے عہد کے مشاہیر علما و مشائخ نے آپ کی علمی و روحانی شخصیت اور ممتاز شعرا و ادبا اور نقاد و حکما نے آپ کی شعری و ادبی حیثیت کو بھی تسلیم کیا ہے- علامہ عبد الحلیم فرنگی محلی لکھنوی، مفتی یوسف فرنگی محلی لکھنوی، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، مولانا محمد علی جوہر، مجاہد آزادی عارف ہسوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا خیر بہوروی سمیت نامور علما و دانشوران نے آپ کی علمی شوکت اور شاعرانہ عظمت کو سراہا ہے-

حکیم محمد اسحاق حاذق موہانی جو آپ کے خاص احباب میں سے تھے اور ان کے دیوان ''مدینۂ نعمت'' کو حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی قدس سرہ اپنی آنکھوں سے لگاتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ

دیوان بارگاہ رسالت میں مقبول ہو چکا ہے'' حکیم صاحب سے جب کوئی کہتا تھا کہ حضرت آسی نے نہ تو کسی سے طب پڑھی نہ کسی کے مطب میں بیٹھے اور شفا کا یہ حال ہے جو مریض ان کے ہاتھ میں آیا وہ آنا فاناً صحت یاب ہوا تو وہ فرماتے کہ ارسطو اور بوعلی سینا کو کس نے طب پڑھائی تھی؟ یہ ان دماغ کے لوگوں میں ہیں جو طب ایجاد کریں، ان کو استاد کی کیا ضرورت ہے؟ (۱۴)'' اور علامہ کیفی چریا کوٹی نے آپ کی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے بہترین انداز میں خراج عقیدت پیش کیا ہے کہ ''حضرت آسی اپنے وقت کے سجادۂ شاعری کے شیخ اعظم تھے، تصوف کی شاعری میں ان کا جو رنگ ہے، ان سے پہلے اور ان کے بعد کوئی ان کا مثل نظر نہیں آتا- (۱۵)''

غالب کا اعتراف واستعجاب: آپ کی ادبی وفکری جولانیت، زبان وبیان قدرت ومہارت، کلام کی معنویت واہمیت اور اس میں شگفتگی وسنجیدگی کو سن کر غالب بھی عالم استعجاب میں پڑ گئے اور آپ کی ہمہ صفات شخصیت کا برملا اظہار واعتراف کیا- چناں چہ آپ نے اپنی چند غزلیں مولوی عبدالصمد صمد غازی پوری کو دے دی، مولوی صاحب خود دہلی گئے تو غالب سے ملے اور وہ غزلیں سنائیں- غالب دم بخود سنتے رہے، اس کے بعد فرمایا کہ ''اللہ اللہ ایسے لکھنے والے اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں؟ (۱۶)'' چودہویں صدی ہجری میں تصوف، صوفیہ اور صوفیانہ شاعری کے حوالے سے جب جب تذکرہ ہوگا، اس میں حضرت آسی غازی پوری کا نام نمایاں ہو کر آئے گا، بلکہ تاریخ تصوف ان کے بغیر نامکمل سمجھی جائے گی-

ارباب علم وادب سے تعلقات: آپ کی ذات شریعت وطریقت کا حسین سنگم تھی اور شخصیت انتہائی نرالی و پر کشش تھی، آپ کی بارگاہ عالیہ میں مریدین ومعتقدین کے علاوہ ادبا وشعرا کا ہجوم رہتا جو آپ کے شمع علم وروحانیت پر پروانوں کی طرح گردش کرتے رہتے، حلقہ احباب بھی بڑا وسیع تھا، ان میں ارباب علم وتصوف اور اصحاب ذوق وادب زیادہ ہوا کرتے، جن کے دلوں میں آپ کے تئیں حد درجہ محبت واحترام کا جذبہ موجزن تھا، جن میں سید جعفر حسین کا شف لکھنوی، حکیم محمد اسحاق حاذق موہانی، مولانا رحمت اللہ غازی پوری (بانی مدرسہ چشمۂ رحمت کالج غازی پور)، میر محمد جان صدق جون پوری، حکیم جمیل الدین دہلوی، حفیظ جون پوری، اکبر دانا پوری، شاد عظیم آبادی، نواب محمد خاں ذکی، منشی امیر احمد مینائی لکھنوی وغیرہ شامل ہیں-

شعروادب کا فروغ: شعروادب کی دنیا میں آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، آپ نے بڑے کاملین فن اور ماہرین شعروادب تلامذہ پیدا کیے جن میں سے اکثر صاحب دواوین گزرے ہیں، آپ کے بعد آپ کے تلامذہ نے شعروادب کی بزمیں آراستہ کیں اور اپنی شعری وادبی جولانیتوں سے شعروادب کے دائرے کو بہت دور دور تک پھیلایا-

مشاہیر معاصرین: سید شاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی، مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، مولانا شاہ عبدالقادر عثمانی بدایونی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، شیخ انواراللہ فاروقی حیدرآبادی، شاہ حفیظ الدین لطیفی رحمٰن پوری، سید شاہ شہود الحق اصدقی، خواجہ الطاف حسین حالی، نواب مرزا خاں داغ دہلوی، علامہ اقبال، شاہ سراج الدین بیدم وارثی-

تصانیف: آپ نے اپنی ہمہ گیر مصروفیات کے باوجود کچھ نقوش قلم بھی چھوڑے ہیں جو کافی اہم اور قیمتی ہیں، دوران تدریس اپنے تلامذہ کی تعلیم کے لیے خود انہی کے نام سے منسوب نحو، صرف، منطق مختلف علوم وفنون پر مشتمل کتابیں تصنیف فرمائیں، فوائد جوہریہ، سراج الصرف، فوائد محمدیہ، فوائد سراجیہ، رسالۂ فریدیہ، رسالۂ احمدیہ وغیرہ جیسی علمی وفنی کتابیں تصنیف فرمائیں اور خالص صوفیانہ اسرار وکنایات اور فوائد نکات پر مبنی عین المعارف (دیوان آسی) کے نام سے شعروادب میں ایک اہم اضافہ فرمایا-

کمالات وکارنامے: آپ عالم وفقیہ، منطقی وفلسفی، عارف وصوفی، واعظ ومصلح، داعی ومبلغ، حکیم وطبیب، مصنف وشاعر اور خانقاہ رشیدیہ جون پور کے آٹھویں سجادہ نشیں غرض کہ مختلف خوبیوں اور کمالات کے جامع تھے، آپ نے دینی ومذہبی، علمی وادبی، سماجی ومعاشرتی مختلف میدانوں میں اپنی گراں قدر خدمات پیش کیں، جن کی علمی ودرسی صلاحیت کی علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنوی، مفتی یوسف فرنگی محلی لکھنوی جیسے نامور اور باکمال اساتذہ نے داد وتحسین فرمائی- درس وتدریس اور تربیت وتزکیہ کے ذریعے صاحب فضل وکمال خلفا ومریدین اور نامور شعرا وتلامذہ پید کیے، مختلف علوم وفنون پر مشتمل قابل قدر رسالے تحریر فرمائے، عین المعارف کی شکل میں شائقین علوم طریقت ومعرفت کو عمدہ سامان اور تحفہ عطا فرمایا، ادبی ذخیروں اور قابل قدر دواوین میں ایک

اہم اضافہ کیا اور عارفانہ وصوفیانہ شاعری کو فروغ دے کر ایک ممتاز اور نمایاں مقام حاصل کیا، چودھویں صدی ہجری میں تصوف وسلوک کی بہترین ترجمانی وعلم برداری کر کے تصوف وصوفیہ کے مشن کو آگے بڑھایا، سلسلۂ رشیدیہ جون پور کی تعمیر وتوسیع اور اس کے دائرۂ دعوت و ارشاد کو خلفا ومریدین کے ذریعے ملک وبیرون ملک میں خوب وسیع و عام کیا-

خدمات کی سند وقبولیت: وصال سے چار پانچ برس پہلے حضرت آسی پر نسبت چشتیت کا بہت زیادہ غلبہ ہو گیا تھا- چناں چہ سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں مندرجہ تین شعر اپنے مرید وخلیفہ شاہ عبدالسبحان قدس سرہ کی معرفت اجمیر حاضری پر کہلوایا-

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا
میں اور مئے ناب میرا منہ یہ کہاں ہے
تلچھٹ بھی اگر دے کرم پیر مغاں ہے
یک نظر فرما کہ مستثنیٰ شوم زابنائے جنس
سگ کہ شد منظور نجم الدین را سرور است

ایک مرتبہ صوفی شاہ عبدالسبحان مراقبے میں تھے تو حضرت سلطان الہند خواجہ غریب نواز کی زیارت سے مشرف ہوئے اور انھوں نے یہ ارشاد فرمایا:

''میں محمد عبدالعلیم کا ہوں اور محمد عبدالعلیم میرے ہیں-''

اسی طرح حضرت سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رضی اللہ عنہ کے مزار پر مراقب تھے کہ حضرت محبوب الٰہی نے یہ زریں قول ارشاد فرمایا:

''محمد عبدالعلیم کو میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ میرے سلسلے کا رواج ان اطراف میں تمہاری ذات سے قائم ہے-(۱۷)''

یہ قبولیت اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کی دینی ودعوتی خدمات کو قبول فرمالیا ہے اور آپ بانی سلسلۂ رشیدیہ حضرت قطب الاقطاب جون پوری قدس سرہ، پیران کرام، صوفیہ اسلام اور سلاسل طریقت کے مشن ومقصد کے سچے امین وجانشیں اور ترجمان وعلم بردار تھے-

وصال مبارک: حکمت وبصیرت، امانت ودیانت اور خاموش مزاجی کے ساتھ قابل قدر دینی وعلمی خدمات اور خانقاہی روایات ومعمولات کو نہایت احسن طریقے پر انجام دے کر آپ ۲/ جمادی الاولی ۱۳۳۵ھ کو پچاسی برس کی عمر میں وابستگان سلسلۂ رشیدیہ سے ہمیشہ کے لیے پردہ فرما کر واصل بحق ہو گئے-

مزار پر انوار: آپ کا مزار اقدس محلّہ نورالدین پورہ غازی پور ضلع بلیا یوپی میں مرجع انام ہے، جس سے فیوض وبرکات ہمہ دم جاری وساری ہیں-□□□

کتابیات

(۱) عین المعارف، مرتبہ سید شاہ شاہد علی فانی گورکھپوری، انجمن فیضان رشیدی کمرہٹی کلکتہ، ص:۴۱
(۲) سمات الاخیار، عبدالمجید کاتب مصطفیٰ آبادی، ڈیفنس ہاؤ سنگ کراچی، ص:۲۵۱
(۳) نفس مصدر، ص:۴۱
(۴) نفس مصدر، ص:۴۱
(۵) نفس مصدر، ص:۴۲
(۶) نفس مصدر، ص:۴۲
(۷) نفس مصدر، ص ۲۵۱
(۸) سمات الاخیار، ص ۲۵۱
(۹) عین المعارف، ص: ۴۷-۴۸
(۱۰) نفس مصدر، ص: ۴۷
(۱۱) نفس مصدر، ص: ۴۷
(۱۲) سمات الاخیار، ص ۲۵۱
(۱۳) حضرت آسی غازی پوری: حیات اور شاعری، ڈاکٹر کاظم ہاشمی، ناشر سلطانہ ہاشمی پٹنہ، ص: ۱۷
(۱۴) عین المعارف، ص: ۴۷
(۱۵) نیا دور دہلی، شمارہ اگست، ۱۹۸۳ء
(۱۶) عین المعارف (ص: ۵۷)
(۱۷) نفس مصدر (ص: ۶۷-۶۸)
(۱۸) مجلّہ 'الاحسان' الہ آباد-۳

☆abrarrashidi@gmail.com

پروفیسر فاروق احمد صدیقی ☆

حضرت آسی غازی پوری کی نعتیہ شاعری

ایک عالم ربانی، صوفی باصفا اور شاعر خوش نوا کی حیثیت سے حضرت مولانا شاہ عبدالعلیم آسی غازی پوری علیہ الرحمہ کی ذات والا صفات ہماری مذہبی و ادبی تاریخ میں بے حد ممتاز و محترم ہے- سلسلۂ رشیدیہ کے ایک عارف کامل اور پیر لاثانی کی حیثیت سے انہوں نے ایک عالم کو فیض یاب کیا ہے- ان کے تقویٰ، طہارت، اخلاص، للّٰہیت اور خشیت الٰہی کے تعارف کے لیے کسی سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں- ان کے فیوض و برکات کا بادل ان کی حیات ظاہری میں بھی ٹوٹ کر برسا اور آج بھی ان کی فیاضیوں اور فیض رسانیوں کا نورانی سلسلہ جاری ہے مگر:

آنکھ والا ترے جلووں کا تماشا دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

حضرت آسی کی شخصیت کثیر الجہات ہے، مگر یہاں ان کی صرف شاعرانہ حیثیت زیر بحث ہے- بحیثیت شاعر خوش و کلام خوش نوا وہ اپنے معاصرین میں مرکز توجہ بنے رہے اور اپنی بے مثل استادی و فن کاری سے انہوں نے اپنے پورے دور کو متاثر کیا؛ لیکن ان کے وصال کے بعد ان کی شاعرانہ حیثیت ان کی روحانی حیثیت کے مقابلے میں بتدریج مغلوب ہوتی چلی گئی- ادبی دنیا میں ان کو روشناس کرانے کی اولین مخلصانہ کوشش اردو کے ممتاز ترقی پسند نقاد پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے کی- انہوں نے ایک طویل فاضلانہ مضمون لکھ کر حضرت آسی کے شاعرانہ مقام و مرتبے کو متعین کرنے میں گہری دلچسپی لی- انہوں نے ان کے فکر و فن کے مختلف جہات کو پوری دیانت داری اور غیر جانب داری کے ساتھ منور کیا؛ لیکن ان کی یہ ساری کاوشیں حضرت آسی کی غزل گوئی کے ادراک و احاطے تک محدود رہیں- دوسری اصناف میں حضرت آسی کی فتوحات کو انہوں نے ہاتھ نہیں لگایا- جب کہ غزل گوئی کے علاوہ حضرت کے کارنامے نعت، رباعی، قصیدہ اور قطعات کی شکل میں بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں- اردو کے ممتاز شاعر و نقاد فراق گورکھپوری نے حضرت آسی کی رباعی نگاری سے اپنی بے پناہ قربت و وابستگی کا اظہار کیا ہے- ان کے علاوہ اور جن ادیبوں اور سخن شناسوں نے حضرت آسی کی شاعرانہ کارگزاریوں کا جائزہ لیا ہے، ادبی دنیا میں ان کی کوئی خاص پہچان نہیں، اس لیے ان کے تذکرے سے صرف نظر کیا جاتا ہے-

غزل کے علاوہ ان کی فنکارانہ بصیرت سب سے زیادہ صنف نعت میں بروئے کار آیا ہے- نعت گوئی سے حضرت آسی جیسے عاشق رسول کو دلچسپی نہیں ہوتی تو یہ حیرت کی بات ہوتی- پھول کی تعریف کچھ بلبل کو ہی زیب دیتی ہے- اس لیے حضرت آسی نے ایک عالی مرتبت مداح رسول کی حیثیت سے جو روح پرور کلام کا قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے، وہ اقدار اور معیار دونوں اعتبار سے مستغنی عن التوصیف ہے- نعت جیسا کہ سب کو معلوم ہے ممدوح کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف کے لیے مخصوص ہے؛ لیکن اس کے لیے جذبۂ صادق اور خامۂ ہشیار لازمی شرطیں ہیں- ایک نعت گو کو حضور پاک صاحب لولاک کی معظم و محتشم ذات سے جب تک سچی محبت اور والہانہ عقیدت نہیں ہوگی وہ نعت گوئی کے تقاضے کا ادنیٰ حق بھی ادا نہیں کر سکتا- یہ تو معلوم ہے کہ نعت گوئی تیز تلوار کی دھار پر قدم رکھنے کے برابر ہے- شاعر کا قلم جب تک حد درجہ محتاط اور موید من اللہ نہیں ہو وہ اس راہ دشوار کو طے نہیں کر سکتا- حضرت آسی علیہ الرحمہ نہ صرف یہ کہ دونوں شرطوں کے امین و علمبردار تھے بلکہ قائل و متبع بھی تھے- اس لیے ان کے یہاں کسی بھی طرح کی کمی اور کجی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اِلاّ یہ کہ قاری یا سامع دینی بصیرت سے محروم اور بالکل سطحی ذہن و صلاحیت کا مالک ہو تو تفہیم شعر کے مرحلے میں وہ ٹھوکریں کھا سکتا ہے، جیسا کہ حضرت آسی کے درج ذیل معروف شعر کے ساتھ سانحہ ہوا:

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

اس شعر کو حضرت آسی کے زمانے میں بھی اعتراضات کا نشانہ بنایا گیا اور آج بھی یہ مکروہ سلسلہ جاری ہے جس کا تقریر و تحریر میں مظاہرہ ہوتا رہتا ہے، بلکہ اب تو ظالموں نے یہاں تک ناروا جسارت کی ہے کہ

اصل شعر کے متن میں اپنی طرف سے تحریف کر کے ''وہی جو مستوی عرش ہے'' کو ''وہ جو مستوی عرش تھا'' لکھ کر شاعر کو مطعون کرنے کا جواز فراہم کیا ہے- کاش ان نابالغ ذہنوں کو یہ علم واحساس ہوتا کہ ''ہے'' کو ''تھا'' کردینے سے کس طرح مفہوم میں زمین وآسمان کا فرق پیدا ہوجاتا ہے- اس شعر کی تفہیم کے سلسلے میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے میں خود حضرت موصوف کا ارشاد نقل کر دینا چاہتا ہوں، تاکہ غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو لگام لگ جائے- حضرت آسی کے دیوان 'عین المعارف' کے مولف سید شاہ شاہد علی سبز پوش رشیدی رقم طراز ہیں:

''حضرت کا ایک مطلع ہے جس پر کم علم مولویوں نے کفر اور شرک کا فتویٰ دینے سے دریغ نہیں کیا- حضرت نے جب یہ غزل کہی تھی، میں خدمت میں حاضر تھا- مطلع یہ ہے:

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہوکر
اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہوکر

جب یہ مطلع فرمایا تو میری طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ میاں شاہد! جہلا اس شعر پر اعتراض کریں گے مگر ان کے اعتراض کا جواب مصرع اولیٰ میں موجود ہے، یعنی وہ ابھی مستوی علی العرش ہے- افسوس کہ اگر معترضین حضرت شیخ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فصوص الحکم وغیرہ دیکھے ہوتے تو اس گستاخی کی جرأت نہ ہوتی- اگر مصرعۂ اولیٰ میں 'وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہوکر' تو البتہ ان کا اعتراض خدا کے مجسم ہونے کا صحیح ہوتا، وہ تو اب بھی مستوی علی العرش ہے- مدینہ میں اترنا باعتبار نزول صفات کے ہے جیسے آفتاب آئینے میں اترتا ہے، الان کما کان-'' (عین المعارف ص: ۵۸-۵۷)

اس غزل کا مقطع ہے:

نثار کیوں نہ کریں جان اس پہ اے آسی
فلک سے جاکے لگے جس کی خاک پا ہوکر

اس شعر میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر معراج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب آپ نے سیر سماوات فرمائی تو آپ کی خاک پا کو تمام افلاک نے سرمۂ بینش سمجھ کر آنکھوں سے لگایا تو ہم زمین کی ہستی پر رہنے والوں کو تو بدرجۂ اولیٰ اس خاک کی عظمت وتقدس پر اپنی جان نچھاور کرنی چاہیے-

حضرت آسی کی سب سے مشہور نعت پاک راقم الحروف کی نظروں میں وہ ہے جو مطلع ذیل سے شروع ہوتی ہے:

نہ میرے دل، نہ جگر پر، نہ دیدۂ تر پر
کرم کرے وہ نشان قدم تو پتھر پر

مجھ تک ایک زبانی روایت یہ پہنچی ہے کہ جب نقش پائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خانقاہ رشیدیہ جون پور میں یا خود شہر غازی پور کی کسی خانقاہ میں پہنچا تو اس کو دیکھ کر آپ میں تحریک پیدا ہوئی اور متاع لوح وقلم لے کر بیٹھ گئے جس کے نتیجے میں یہ نو اشعار پر مشتمل نعت پاک وجود میں آگئی جس کا ہر شعر انتخاب کا درجہ رکھتا ہے- فکری وفنی دونوں اعتبار سے اس کا ہر شعر اپنی مثال آپ ہے- یہی وجہ ہے کہ حضرت آسی کے زمانے سے لے کر آج تک یہ نعت پاک میلاد شریف کی محفلوں، عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسوں، خانقاہوں کی روحانی تقریبات اور دیگر دینی مجلسوں میں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اور خود راقم الحروف بھی اس نعت پاک کو پڑھ کر اپنے ایمان کو مجلی کرتا رہتا ہے- اس کے دو اشعار تو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور وہ یہ ہیں:

پلا دے آج کہ مرتے ہیں رند اے ساقی
ضرور کیا کہ یہ جلسہ ہو حوض کوثر پر
اخیر وقت ہے آسی چلو مدینے کو
نثار ہوکے مرو تربت پیمبر پر

مدینہ پاک سے ایسی والہانہ عقیدت ووابستگی اور وہاں اپنی جان آفریں کو نذر کرنے کا تصور کس قدر عشق رسول میں فنا ہونے کا مظہر ہے اس کا صحیح اندازہ وہی کر سکتے ہیں جن کے سامنے شاعر مشرق علامہ اقبال کا یہ شعر موجود ہو ؎

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

اخیر وقت میں مدینہ پاک جانے کی آرزو اس لیے بھی بے تاب کیے ہوئے ہے کہ بقول اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی وہ شہر شفاعت نگر ہے:

طیبہ میں مر کے ٹھنڈے چلے جاؤ آنکھیں بند
سیدھی سڑک یہ شہر شفاعت نگر کی ہے

حضرت آسی کی زیرنظر نعت پاک کا یہ شعر بھی بڑا ہی ایمان افروز اور شفاعت آقا صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل بھروسہ رکھنے پر شاہد ہے- زور بیان ملاحظہ ہو ؎

گناہ گار ہوں میں واعظو! تمہیں کیا فکر
میرا معاملہ چھوڑو شفیع محشر پر

شفیع محشر صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت آسی علیہ الرحمہ کا غیر متزلزل ایمان ہم گناہ گاروں کے لیے چشم کشا ہے- ان کی مرضی اور توسل کے بغیر کسی بھی شخص کی جان بخشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا- اسے ایک شعر کے ذریعے ملت اسلامیہ کو حضرت آسی نے جو پیغام دیا ہے اس کو اپنے خانہ دل میں محفوظ کر لینے کی ضرورت ہے- اسی مفہوم کا ان کا یہ شعر بھی بہت بلند پایہ ہے ؎

نہیں اپنے گناہوں کا مجھے غم
میں آسی ہوں گنہگار محمد صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت آسی کی ایک نعت پاک کا مطلع ہے:

وہاں پہنچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد
تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

اس شعر کو کلمہ طیبہ کا بہت خوبصورت اور ایمان افروز ترجمہ کہا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں- ظاہر ہے عہد صحابہ سے لے کر آج تک ہر مومن مخلص کا یہی ایمان و ایقان ہے کہ خدا کے بعد محبوب خدا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہی مقام و مرتبہ ہے- وہی جان ایمان ہیں، وہی شفیع محشر ہیں- ان کی نگاہ کرم کے بغیر نجات و مغفرت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا- اس لیے ان کے نام کی رٹ خدا کے نام کے بعد تو ہونی ہی چاہیے- یہ شعر اپنی لازوال صداقت کے باعث آفاقی شہرت کا حامل ہوا اور آج کے تو ہب زدہ ماحول میں بھی یہ شعر اپنی حقانیت کا پرچم لہرا رہا ہے- حضرت آسی نے اس شعر کے علاوہ اور کوئی نعتیہ شعر نہیں کہا ہوتا تو بھی اس شعر کی بدولت اردو کے مشاہیر نعت گو شعرا کی صف میں مقام امتیاز رکھتے-

ان کی ایک نعت پاک کا مطلع ہے:

کہاں گلشن کہاں روئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کہاں سنبل کہاں روئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

یہ سات اشعار پر مشتمل ہے اور ہر شعر فکر بلند اور فن لطیف کا آئینہ دار ہے؛ لیکن مطلع تو اپنی مثال آپ ہے- اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کے سامنے گلشن و گلزار کو نا قابل التفات قرار دیا گیا ہے- یہاں تک کہ پھولوں کا راجا گلاب بھی آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے روئے انور کے سامنے ہیچ ہے، کیوں کہ وہ تو خود آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسم اطہر سے ٹپکے ہوئے پسینے کی پیداوار ہے، جیسا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

> ''بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینۂ مبارک سے گلاب کا پھول پیدا ہوا ہے، نیز مروی ہے کہ فرمایا معراج سے واپسی پر میرے پسینے کا قطرہ زمین پر گرا تو اس سے گلاب کی روئیدگی ہوئی جو کوئی میری خوشبو سونگھنا چاہے وہ گلاب کو سونگھے-''
>
> (مدارج النبوۃ، حصہ اول، اردو ترجمہ، ص: ۴۷، ۴۶)

اس مضمون کو حضرت رضا بریلوی نے بھی باندھا ہے اور حق یہ ہے کہ اس کا حق ادا کر دیا ہے- ملاحظہ ہو ؎

وہ گلاب لبہائے نازک ان کے ہزاروں چھڑ کتے ہیں پھول جن سے
گلاب گلشن میں دیکھے بلبل یہ دیکھ گلشن گلاب میں ہے

حضرت آسی کی زیرنظر نعت کا یہ شعر بھی نہایت عمدہ ہے:

ہے کیا رحم و کرم بندوں پر اپنے
خدا سے ملتی ہے خوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

یہاں مصرع اول میں رحم و کرم کے الفاظ بہت ہی جامعیت کے حامل ہیں- یہاں دراصل آیت پاک ''و بالمومنین رؤف رحیم'' سے استفادہ کرتے ہوئے حضرت آسی نے کہا ہے کہ ''خدا سے ملتی ہے خوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم''، یعنی رحمت و رأفت کی صفت دونوں میں موجود ہے- خدا بھی رؤف و رحیم ہے اور رسول بھی اس کے کرم سے رؤف و رحیم ہیں-

اور یہ تو امت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ ''محمد نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا''، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وجہ تخلیق عالم و آدم ہیں- حضرت نے بھی اس مضمون کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنی ایک نعت میں باندھا ہے-

اے سر تخلیق آدم صلی اللہ علیہ وسلم
اے نور خلاق عالم صلی اللہ علیہ وسلم
تھا نہیں کچھ بھی نشان عالم آپ تھے جب سلطان عالم
صدقے آپ کے جان عالم صلی اللہ علیہ وسلم

اس نعت پاک کا بھی ہر شعر منتخب ہے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کاملہ اور شفاعت کبریٰ پر ایمان کامل رکھنے کی بدولت حضرت آسی یوم الحساب کی دارو گیر سے خود کو بالکل مامون سمجھتے ہیں اور بڑی مستی و سرشاری کے عالم میں کہتے ہیں

جھومتا جاتا ہے آسی حشر میں
عاشقان سرور عالم کے ساتھ

کہیں جھومتے جھامتے ہوئے جانا اسی شخص کو زیب دیتا ہے جو تمام تفکرات اور تردداتات سے آزاد ہو۔ قیامت کا ہولناک منظر جہاں نفسی نفسی کا عالم ہوگا اور ہر شخص اپنی نجات کے غم میں کرب واضطراب سے دوچار ہوگا۔ وہاں جھومتے ہوئے جانے کی جسارت وہی کرسکتا ہے جس کو اپنے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت بے پایاں اور بندہ نوازی پر غیر معمولی بھروسہ ہوگا۔ حضرت آسی غازی پوری یقیناً اپنے آپ کو ان خاصان خدا اور خاصان رسول میں سمجھتے ہیں جن کے لیے یہ سعادت مقدر ہے۔ اسی لیے ایمان ویقین کی گہرائی میں ڈوب کر انہوں نے یہ شعر کہا ہے۔ اس شعر کا لب ولہجہ اور طرز ادا بھی بے حد دل نشیں اور روح پرور ہے، اسی قبیل کا درج ذیل شعر بھی ہے جو فکری اعتبار سے بہت ہی بلند و برگزیدہ ہے اور اس میں بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی آسی نوازی پر بے انتہا فخر ومسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

مجھ سے مجرم کے لیے خلد بریں
مہربانی ہے رسول اللہ کی

حضرت آسی علیہ الرحمہ کو حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تو بے پایاں عقیدت ومحبت ہے ہی آپ کے مسکن و مدفن شہر مدینہ طیبہ اور وہاں کے ذرے ذرے اور چپے چپے سے بھی والہانہ لگاؤ ہے اور یہ ہونا بھی چاہیے تھا۔ بقول شاعر:

من مذهبي حب الديار لاهلها
و في العشق مما يعشقون مذاهب

صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔ دیکھیے وہ کوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کس احترام واکرام کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں ۔

اے پائے نظر! ہوش میں آ، کوئے نبی ہے
آنکھوں سے بھی چلنا تو یہاں بے ادبی ہے

کوئے نبی میں سر کے بل چلنے کی تمنا تو ہمارے اور بزرگوں نے بھی کی ہے، لیکن آنکھوں سے بھی چلنے کو بے ادبی پر محمول کرنا یہ بلا شرکت غیرے حضرت آسی کا ہی حصہ ہے۔

حضرت آسی کی ایک نعت ہے جو درج ذیل مطلع سے شروع ہوتی ہے

یا نبی دل سے تیرے عشق میں جلنے کے لیے
جان بے تاب ہے فرقت میں نکلنے کے لیے

اس کا ایک شعر یہ بھی ہے ۔

ترے عشاق کے چہرے پہ جو آتا ہے عرق
حوریں لے جاتی ہیں پوشاک میں ملنے لیے

حضور جان نور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر سے نکلے ہوئے پسینے کی عظمت تو مسلم ہے۔ اس سلسلے میں حضرت ام سلیم کا عمل ایک مشہور واقعہ ہے۔ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینہ اقدس کو بطور مشک وعنبر استعمال کرنے کی روایتیں تو معلوم ومعروف ہیں ؛ لیکن عشاق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چہروں کے پسینے کو حوران جنت کا اپنی پوشاک میں ملنے کے لیے لے جانا یقیناً ایک نیا تصور اور بڑا پاکیزہ خیال ہے۔ میں اپنے مطالعے کی محدودیت کا اعتراف کرتے ہوئے بلا تامل یہ کہنا چاہوں گا کہ اردو کی نعتیہ شاعری کے سرمائے میں اس رنگ وآہنگ کا شعر مجھے کہیں نہیں ملا۔ یہ خاص حضرت آسی کی قوت ایجاد اور فکر بلند کی اہم عطا ہے جس کے لیے ہم ان کی روح معظم کو بصد خلوص واحترام سلام عرض کرتے ہیں۔

حضرت آسی کی ایک مشہور نعت وہ ہے جو فارسی کے ممتاز ومحترم مداح رسول حضرت جامی کے کلام پر تضمین کی حیثیت رکھتی ہے۔ تضمین نگاری کے لیے غیر معمولی انتاجی صلاحیت اور قادر الکلامی لازمی شرطیں ہیں۔ ظاہر ہے حضرت آسی ان اوصاف وکمالات کے مظہر اتم تھے اس لیے انہوں نے نو بندوں پر مشتمل ایک بڑی خوبصورت تضمین کی ہے جو مخمس کی ہیئت میں ہے۔ یہاں صرف دو بند نقل کیے جاتے ہیں

محال خرد ہے مثال محمد ﷺ
سر عرش تک پائے مال محمد ﷺ
یہ پھیلا ہے نور کمال محمد ﷺ
جہاں روشن است از جمال محمد ﷺ
دلم تازہ گشت از وصال محمد ﷺ

بقیہ صفحہ 48 پر ملاحظہ کریں

مجیب الرحمٰن علیمی ☆

خانقاہ وسلسلۂ عالیہ رشیدیہ جون پور: تاریخ اور کارنامے

آج سے تقریباً سات سو سال پہلے سلطان فخر الدین محمد تغلق عرف جونا شاہ نے دریائے گومتی کے کنارے ہموار زمین پر ایک شہر قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر ارادہ پایۂ تکمیل کو پہنچتا کہ ۲۰؍ سال تک ہندوستان کی بادشاہت کی ذمہ داری ادا کر کے ۷۵۲ھ میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا- اس کے بعد اس کا چچازاد بھائی سلطان فیروز شاہ تخت نشیں ہوا اور ۷۷۲ھ میں جب وہ ملک بنگال کی بغاوت و سرکشی کو مٹا کر واپسی میں قصبہ مظفر آباد متصل جون پور خیمہ زن ہوا تو بادشاہ کی نگاہ جانب مغرب لب دریائے گومتی ایک ہموار زمین پر پڑی، چاہا کہ یہاں شہر آباد کرے، اسی شب بادشاہ نے ملک جونا کو خواب میں دیکھا کہ وہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ یہ شہر میرے نام سے موسوم ہو- صبح کو سوار ہو کر موقع کے معائنے کے بعد ایک بلند مقام تجویز کر کے قلعہ بنانے اور اس کے اطراف میں شہر جون پور بسانے کا حکم دیا- سخن وران شاہی نے شہر جون پور کے لفظ سے تاریخ بنا نکالی- اس میں بادشاہ نے ہر فن کے اہل کمال کو نزدیک و دور سے بلا کر آباد کرایا تھا، اسی وجہ سے ایک زمانے میں یہ شہر سلاطین شرقیہ کا دار السلطنت بن گیا جن کی وجہ سے اس شہر کی دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی- علمائے عظام اور صوفیہ کرام کا علمی و دعوتی مرکز رہا ہے، جن کے ذکر سے تاریخ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں- سر دست اس وقت اسی قدیم تاریخی شہر کے ایک قدیم روحانی مرکز، خانقاہ رشیدیہ کی تاریخ اور اس کی دعوتی و علمی خدمات پر روشنی ڈالی جا رہی ہے-

بانی سلسلہ و خانقاہ:

قطب الاقطاب حضرت شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری کے آبا و اجداد میں ایک سے بڑھ کر ایک اولوالعزم اولیا و علما گزرے ہیں- آپ کے اجداد میں بارہویں پشت میں شیخ بخشی رومی کا نام آتا ہے، جنھوں نے اس خاندان میں ولایت کا جھنڈا گاڑا، جن کے بعد اس خاندان میں برابر اہل علم و عرفان پیدا ہوتے رہے- حضرت شیخ بخشی رومی کے اجداد عرب سے آکر ملک روم میں کلد نامی مقام کو جائے سکونت بنایا- اسی وجہ سے آپ رومی کہے جاتے ہیں- روم میں تین پشت گزرنے کے بعد چوتھی پشت میں شیخ بخشی رومی نے روم سے دہلی کا سفر کیا- اس وقت دہلی میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کا سورج نصف النہار پر تھا- آپ سلطان المشائخ کے مرید ہوئے اور بارہ بنکی میں امیٹھی پرگنہ میں قیام پذیر ہوئے- سلطان المشائخ کے وصال کے بعد روحانی نعمتیں آپ نے شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی سے حاصل کیں- شیخ بخشی رومی کے بعد دسویں پشت میں شیخ عبد الحمید نامی ایک بزرگ ہوئے جو بانی سلسلۂ رشیدیہ شیخ محمد رشید کے حقیقی دادا تھے- آپ کے دولڑکے ہوئے: مصطفیٰ اور عثمان- ان دونوں بزرگوں کی آخری آرام گاہ چمنی بازار پورنیہ بہار میں ہے- شیخ عثمان کی اولاد امیٹھی میں بسی ہوئی ہے اور شیخ مصطفیٰ نے شیخ محمد رشید جیسا متبحر عالم اور عارف باللہ فرزند پایا، جس نے اپنے علم و عرفان سے ایک جہاں کو روشن کر دیا-

(سمات الاخیار، ص:۳۲ تا ۳۴ ملخصاً)

حضرت شیخ محمد رشید جون پوری کی پیدائش عہد اکبری میں ۱۰۰۰ھ میں ضلع جون پور کے برونہ موضع میں ہوئی اور وہیں نشو ونما پائی- جون پور کے ایک بزرگ شیخ عبد العزیز جون پوری ثم دہلوی نے فرمایا تھا کہ میرے بعد ایک فقیر پیدا ہوگا جس کا نام محمد رشید ہوگا- ان کے علاوہ ایک اور بزرگ شیخ عبد الجلیل لکھنوی جو آپ کے بچپن میں برونہ میں تشریف لاتے تھے، آپ کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ یہ لڑکا عالم، عامل اور عارف کامل ہوگا- (سمات الاخیار، ص:۶۲ ملخصاً)

آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، متوسطات و اعلیٰ تعلیم آپ نے اپنے حقیقی ماموں مولانا شمس الدین جون پوری اور استاذ العلما شیخ محمد افضل جون پوری سے حاصل کی- علم حدیث حاصل کرنے کی غرض سے آپ نے دہلی کا بھی سفر کیا اور شیخ نور الحق ابن شیخ عبد الحق محدث دہلوی سے علم حدیث اور اس کی سندیں حاصل کیں- (سمات الاخیار، ص: ۶۳؍۶۴ ملخصاً) آپ کی عمر جب نو سال کی ہوئی تو آپ اپنے والد گرامی شیخ مصطفیٰ جمال الحق سے سلسلۂ چشتیہ میں مرید ہوئے اور کلاہ ارادت و خرقۂ خلافت آپ کو آپ کے والد نے پہنا دیا- اس کے بعد

ایک مدت تک تحصیل علوم میں مصروف رہے اور فراغت کے بعد درس وتدریس کی طرف مائل ہو گئے مگر تصوف کا ذوق ضرور تھا اور کسی مرشد کامل کی تلاش بھی تھی- اسی زمانے میں حضرت قدوۃ السالکین مخدوم شیخ طیب بنارسی جون پور میں تشریف لاتے تھے- چناں چہ آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے سلوک ومعرفت کی تعلیم حاصل کی، عین عید کے دن ایک مجمع عام میں مخدوم نے حضرات چشت کی طرف سے اپنا پیرہن پہنایا اور سلسلۂ چشتیہ کے اذکار اور تلقین کی اجازت دی اور جون پور رخصت فرمایا-

حضرت شیخ محمد رشید کی طبیعت، عالی اور ہمت بلند واقع ہوئی تھی- نعمتوں اور فیوض کی طلب میں آپ حریص تھے مگر ساتھ ہی دوسروں کو فیوض پہنچانے میں بھی سخی تھے-جس بزرگ کا نام سنتے اس کے پاس جاتے- اگر اس میں اپنے سے زائد کچھ پاتے تو حاصل کرتے اور کم پاتے تو عطا کرتے- باوجودیکہ حضرت مخدوم نے آپ کو مستغنی بنادیا تھا، مگر آپ کی بلند ہمت نے اتنے ہی پر قانع رہنے نہ دیا، اور انہوں نے میر سید شمس الدین کالپی بخاری، شیخ عبدالقدوس قلندر جون پوری، راجی سید احمد مجتبیٰ مانک پوری وغیرہ سے خلافت واجازت حاصل کی-

خانقاہ رشیدیہ جون پور کا قیام:

حضرت راجی سید احمد مجتبیٰ سے روحانی نعمتوں کو حاصل کرنے کے بعد مانک پور سے جب واپس ہوئے تو جون پور میں حضرت راجی کے حکم کے مطابق ایک خانقاہ قائم کی اور پھر رشد وہدایت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑا، جو آج تک جاری ہے- یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس خانقاہ کے قیام کی تاریخ کیا تھی، مگر اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اس وقت حضرت محمد رشید بانی خانقاہ کی عمر تقریباً ۴۰ ر سال کی تھی، گویا ۱۰۴۰ھ کے آس پاس ہی اس خانقاہ کا قیام عمل میں آیا ہوگا- اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ خانقاہ رشیدیہ تقریباً چارسو سال قدیم خانقاہ ہے، جہاں سے آج بھی علم وعرفان، رشد وہدایت اور خدمت خلق کا کام اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ جاری وساری ہے اور موجودہ صاحب سجادہ حضرت مفتی عبید الرحمٰن رشیدی کی لائق تعریف قیادت میں یہ خانقاہ اور اس سے متعلق چند دیگر خانقاہیں آج بھی کامیابی کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف رواں دواں ہیں- صاحب ''سمات الاخیار'' تحریر فرماتے ہیں:

اس کا پتہ نہیں چلتا کہ خانقاہ رشیدیہ کی بنیاد کس سال پڑی مگر میرا خیال یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ آپ کے عمر کی چالیسویں سال میں خانقاہ تعمیر ہوئی ہوگی اور یہ شاہ جہاں کا زمانہ تھا، جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے- اگر یہ مان لیا جائے تو تادم تحریر اس کو بنے ہوئے تین سو برس ہوتے ہیں- بہر حال حضرت شیخ محمد رشید قدس سرہ نے حضرت راجی سید مجتبیٰ سجادہ نشین خانقاہ مخدوم شیخ حسام الحق مانک پور کے حکم سے اور تمام قبائل آپ کے موضع برونہ سے چلے آئے- آپ نے خانقاہ اور مسجد تعمیر فرمائی، کنواں کھدوایا، مسجد پہلے مسطح تھی بعد کو گنبدی بنی اور خانقاہ پہلے پوش نہ تھی اس پر چھپر پڑا تھا-'' (سمات الاخیار، ص:۴۳؍۴۴)

بانی سلسلۂ رشیدیہ کی سیرت:

حضرت شیخ محمد رشید جون پوری ایک متبحر عالم، عارف باللہ اور زبردست صاحب تصرف بزرگ تھے- آپ سے مدعائے دل ظاہر کرنے کی ضرورت نہ تھی- اٹھتے بیٹھتے اللہ کا لفظ زبان پر جاری رکھتے- قناعت اور استغنا آپ کے مزاج میں ہی داخل تھا- سلاطین اور امرا کے دروازے پر جانا پسند نہ تھا- جس کام کو شروع کرتے اس کو پورا کرتے- کل کا لفظ بغیر ان شاء اللہ نہ فرماتے- تہذیب وادب کا لحاظ رکھتے- ہر کام میں بزرگوں کی پیروی کرتے- مریدوں کو نماز اور عبادت کی تعلیم دیتے اور اس کی پابندی کا حکم فرماتے- بیمار ہوتے تو بہت کم دوا لیتے اور فرماتے کہ دوا میں توکل اچھی چیز ہے اور دوا کرنے کا حکم بھی ہے- سماع سے آپ کو انکار نہ تھا- آپ کسی کی غیبت نہیں سنتے تھے- اگر کوئی ناواقف غیبت کر بیٹھتا تو آپ بیزار ہوتے اور اس کی کسی اچھی بات سے تاویل فرماتے- مثلاً ایک مرتبہ حاجی جلال الدین نے سادات خان حاکم شہر کی شکایت کی، آپ نے فرمایا کہ میرے سامنے کوئی کسی کی بدی ظاہر کرتا ہے تو مجھے اس کے جواب میں مشکل در پیش آتی ہے، کیوں کہ خدا نے بدی اور گمان بد سے منع فرمایا ہے اور اس کے رسول نے حسن ظن کا حکم دیا ہے- لامحالہ مجھے توجیہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے- مثلاً اگر کسی کو رمضان میں سر بازار کھاتے ہوئے دیکھوں تو گمان کروں گا کہ مسافر یا بیمار ہے کہ بھوک کے غلبے سے الگ لے جا کر کھانے کی طاقت نہیں رکھتا ہے- اگر کسی کو ننگے بدن اس طور سے نماز پڑھتا ہوا دیکھوں کہ عورت غلیظ چھپا ہوا ہو، تو سمجھوں گا کہ مالکی المذہب ہے- اگر کسی کو دیکھوں کہ وضو کے بعد بلا تجدید وضو نماز پڑھ رہا ہے تو خیال کروں گا کہ شافعی المذہب ہے- اگر کسی کو جانوں کہ اس نے

شراب پی ہے، کہوں گا توبہ کر لی ہوگی- ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ حاکم شہر ظالم اور رافضی ہے مگر نماز عید اس نے جماعت سے پڑھی تھی آپ نے فرمایا کہ جب تم نے نماز جماعت سے پڑھتے ہوئے دیکھا پھر کیوں اس کے حق میں برا گمان کیا، انسان کو نیکی پر نظر کرنی چاہیے نہ کہ بدی پر-
(سمات الاخیار، ص:۸۲/۸۳ ملخصاً)

بانی سلسلہ رشیدیہ کی علمی خدمات:

آپ کی ذات علمی دنیا میں نہ کل محتاج تعارف تھی اور نہ آج ہے- آپ اپنے دور کے بڑے بڑے عالموں اور محققین پر سبقت لے گئے- آپ کے ہم عصر علما و مشائخ نے جہاں آپ کی روحانی حیثیت کو تسلیم کیا وہیں آپ کی علمی قدر و قیمت کو بھی سراہا ہے- آپ کے اساتذہ نے بھی آپ پر فخر کیا ہے- صاحب شمس بازغہ ملا محمود جون پوری جیسے عالم آپ کے ہم سبق ساتھی تھے- ملا موہن بہاری آپ کے مداحوں میں شامل ہیں- آپ اپنے اساتذہ کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے، بلکہ ان کے گھر کے در و دیوار کا احترام بھی ضروری خیال کرتے تھے- آپ ہمیشہ طالبان علوم نبویہ کو درس دیا کرتے تھے اور ان کی قدر کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ آپ نے وصال کے وقت وصیت کی تھی کہ جس پتھر پہ طلبہ کی جوتیاں اترتی ہیں میری قبر میں اسی کا تختہ دیا جائے-
(سمات الاخبار، ص:۶۵ ملخصاً)

ایک روز آپ حسب معمول استاذ العلما شیخ محمد افضل کی خدمت میں تشریف لے گئے، وہ علم مناظرہ کی کتاب 'شریفیہ' کسی کو پڑھا رہے تھے، آپ کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ متن خوب ہے اگر کوئی اس کی شرح لکھے تو اچھی ہوگی- دوسرے ہفتے میں جب آپ ملنے گئے تو 'شریفیہ' کی شرح ''رشیدیہ'' لکھ کر لے گئے- استاذ العلما نے دیکھ کر بہت پسند فرمایا- یہ شرح ایسی جامع و مانع اور سلیس واقع ہوئی ہے کہ فن مناظرہ میں رشیدیہ کے سوا اور کچھ پڑھنے کی حاجت نہیں ہوتی-
(سمات الاخیار، ص:۶۵)

تصانیف: صاحب سمات الاخیار لکھتے ہیں کہ آپ کی تصانیف بہت ہیں، چند کتابیں جو خانقاہ میں موجود ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) رشیدیہ: یہ شریفیہ کی شرح ہے، فن مناظرہ کی مشہور کتاب ہے، یہ کتاب چھپ گئی ہے اور درس میں داخل ہے-

(۲) تذکرۃ النحو: نحو کے مسائل میں چند ورقوں کا رسالہ ہے جس کو آپ نے اپنے صاحب زادے حضرت شیخ محمد ارشد کے کے لیے لکھا تھا- اس کی ابتدا میں اعلم ارشدک اللہ تعالیٰ لکھا ہے- اب خلاصۃ النحو کے سے نام مشہور ہے اور نحو میر کے آخر میں طبع ہے-

(۳) زاد السالکین: یہ رسالہ تصوف سے متعلق ہے، جس کو آپ نے اپنے پہلے مرید حضرت شیخ عبد المجید کے لیے تحریر فرمایا ہے-

(۴) مقصود الطالبین: یہ کتاب بھی تصوف میں ہے- اس میں معارف اور حقائق کی باتیں مرقوم ہیں- حضرت نصرت جمال ملتانی کے لیے لکھی گئی تھی-

(۵) ترجمہ معینیہ: یہ رسالہ تذکرۃ النحو کی شرح ہے- حضرت شیخ غلام معین الدین کے پڑھنے کے لیے تحریر فرمایا تھا-

(۶) بدایۃ النحو: یہ بھی نحو کا رسالہ ہے، جس کو اپنے بیٹے شیخ محمد حمید کے لیے لکھا تھا-

(۷) مکتوبات: یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو اکثر خلفا کے نام بطور جواب کے لکھے تھے-

(۸) دیوان شمسی: آپ کے فارسی و ہندی اشعار کا مجموعہ ہے- آپ شمسی کا تخلص فرماتے تھے- صاحب خزینۃ الاصفیا کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شیخ اکبر کی تصنیف اسرار المخلوقات پر ایک بسیط شرح لکھی ہے- رشیدیہ اور تذکرۃ النحو کے سوا سب رسالے قلمی ہیں، اب تک چھپے نہیں-

جس طرح آپ کی تصانیف کی کثرت ہے، اس سے کئی گنا زیادہ آپ کے جید تلامذہ کی تعداد ہے- آپ کے تلامذہ میں سے اکثر نے آپ ہی سے طریقت میں بھی اجازت و خلافت حاصل کی یا کم از کم آپ کے مرید ہوئے-

بانی سلسلہ رشیدیہ کی دعوتی خدمات:

سلسلہ رشیدیہ کو جاری ہوئے تقریباً چار سو سال کا طویل عرصہ گزر گیا، مگر آج بھی اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ یہ سلسلہ جاری ہے- مخلوق خدا کی خدمت اور رشد و ہدایت کا کام بحسن و خوبی انجام پا رہا ہے- اس سلسلے کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں سجادگی میراثی نہیں ہے- پورے سلسلے میں جو اولوالعزم علما و مشائخ اور صالحین ہوں گے وہ اتفاق رائے سے سلسلے کے کسی فرد کو جو اجازت اور خلافت یافتہ ہوگا اس کو سجادگی کے لیے منتخب کرتے ہیں- یہ طریقہ منہاج نبوت و خلفائے راشدین

کے طریقے کے مطابق ہے- دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ جو اس سلسلہ کا سجادہ ہوگا اس کے ذمے اس سلسلے کی فقط ایک خانقاہ کی ذمہ داری نہ ہوگی بلکہ اس کی چند خانقاہوں کی مکمل ذمہ داری ادا کرنا اس کا دینی اور روحانی فریضہ قرار پاتا ہے- بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ اگر کوئی سجادہ خانقاہی فرائض اور دینی اور روحانی ذمہ داریوں اور خدمت خلق سے لاتعلقی کا ثبوت دیتا ہے، تو اس سلسلے کے اصحاب حل وعقد نے جس طرح ان کو منتخب کیا تھا اسی طرح ان کو معزول بھی کر سکتے ہیں اور کسی دوسرے کو اس عہدے کے لیے منتخب کرنے کا حق بھی رکھتے ہیں- آج جب کہ ہم زمانۂ نبوت سے چودہ سو سال دور ہو چکے ہیں، یہ خانقاہ اپنی مثال آپ ہے- دوسری تمام خانقاہوں کو اس سے سبق لینا چاہیے-

بانی سلسلہ شیخ محمد رشید قدس سرہ نے آج سے چار سو سال پہلے اللہ و رسول ﷺ کی رضا کے مطابق دعوت وتبلیغ اور علم وعرفان کا جو نظام قائم کیا تھا وہ آج بھی قائم ہے اور آپ کے خلفا اور سلسلے کے افراد اپنے اسلاف کے طریقے کے مطابق دعوت وتبلیغ، رشد وہدایت کا فریضہ انجام دینے میں مصروف ہیں- بانی سلسلہ نے جو دعوتی نظام برپا کیا تھا وہ اپنی پوری تابانی کے ساتھ آج بھی جاری ہے اور اس سلسلے کی مختلف خانقاہیں خدمت خلق میں آج بھی مصروف ہیں- ان خانقاہوں کے ذریعے مخلوق خدا کی علمی اور روحانی سیرابی کا سامان آج بھی فراہم کیا جا رہا ہے- بانی سلسلہ کے خلفا اور پھر ان کے خلفا کا جو ایک لمبا سلسلہ چلا اور چل رہا ہے، ان تمام کا سہرا بانی سلسلہ شیخ محمد رشید قدس سرہ کے سر جاتا ہے-

آپ کے خلفا کثرت سے ہیں جو کامل اور جید خلیفہ تھے، جن میں حضرت شیخ عبد المجید، حضرت ملا عبد الشکور منیری، مولانا نور الدین مداری جون پوری، حضرت نصرت جمال ملتانی جامع گنج رشیدی، حضرت شیخ عبد اللہ مظھن پوری، میر محمد صادق قدس سرہٗ جون پوری، سید محی الدین محمد آبادی، شیخ عبد اللہ خویشگی، حاجی شیخ جلال الدین جون پوری، شیخ عبد الحی فتح پوری ہسوی، میر سید نور پٹنوی، شیخ عبد اللہ بنگالی، شیخ عبد الواحد مشتاق فتح پوری، شیخ حبیب اللہ بہاری، میر سید سیف الدین مدن پوری، شیخ ضیاء الدین خویشگی، میر سید نور پورنوی، قاضی محمد مودود جون پوری، حضرت راجی خضر مانک پوری، شیخ غلام محی الدین متوکل جون پوری، میر سید محمد اسماعیل سیوانی، حضرت شیخ محمد ارشد رشید وغیرہ جیسے اصحاب فضل وکمال شامل ہیں- (سمات الاخیار، ص: ۱۰۱ تا ۱۰۴)

ان کے علاوہ تین اور اولو العزم خلفا یہ ہیں: (۱) حضرت میر سید قیام الدین قدس سرہ گورکھ پوری (۲) حضرت میر سید محمد جعفر قدس سرہ پٹنوی (۳) حضرت شیخ یٰسین قدس سرہ جھونسوی- ان میں سے بعض کا اجمالی تذکرہ آئندہ صفحات میں قلم بند کیا جائے گا-

سلسلۂ رشیدیہ کے سجادگان ایک نظر میں:

(۱) قطب الاقطاب حضرت شیخ محمد رشید جون پوری (۲) حضرت بدر الحق شیخ محمد ارشد جون پوری (۳) حضرت قمر الحق شیخ غلام رشید جون پوری (۴) حضرت نور الحق شاہ حیدر بخش رشیدی (۵) حضرت قیام الحق شاہ امیر الدین رشیدی (۶) حضرت قطب الہند شاہ غلام معین الدین رشیدی (۷) حضرت شاہ سراج الدین رشیدی (۸) حضرت شاہ محمد عبد العلیم آسی غازی پوری (۹) حضرت شہود الحق سید شاہ شاہد علی سبز پوش رشیدی گورکھپوری (۱۰) حضرت شاہ مصطفیٰ علی سبز پوش رشیدی گورکھپوری (۱۱) حضرت مفتی شاہ عبید الرحمٰن رشیدی (موجودہ صاحب سجادہ)

سلسلۂ رشیدیہ کی سجادگی کے تحت آباد خانقاہیں: (۱) خانقاہ عالیہ رشیدیہ، جون پور (۲) خانقاہ عالیہ طیبیہ، منڈواڈیہہ، بنارس (۳) خانقاہ عالیہ مصطفائیہ، چمنی بازار، پورنیہ، بہار (۴) خانقاہ عالیہ حیدریہ معینیہ، سیوان، بہار (۵) خانقاہ عالیہ علیمیہ، غازی پور-

سلسلۂ رشیدیہ کے چند ممتاز علما ومشائخ:

شیخ محمد رشید قدس سرہٗ جہاں علمی اعتبار سے مرجع خلائق تھے وہیں دوسری طرف طریقت، حقیقت اور معرفت کے لحاظ سے اپنے دور کے شیخ المشائخ تھے- بے شمار لوگوں نے آپ سے اپنی علمی اور روحانی تشنگی دور کی- تلامذہ اور خلفا کی ایک بڑی جماعت آپ نے تیار کی- ۳۴ خلفا کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے- ان کے علاوہ بھی آپ کے خلفا تھے جن کا ذکر نہیں ملتا- ذیل میں اس سلسلے کے بعض اولو العزم خلفا اور مشائخ کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے-

(۱) میر سید قیام الدین گورکھ پوری قدس سرہٗ (م: ۸ صفر ۱۱۲۸ھ) آپ کا اصلی وطن سگڑی اعظم گڑھ تھا- بعد میں آپ نے گورکھ پور کو شرف بخشا- شیخ محمد رشید قدس سرہٗ سے آپ کو ارادت وخلافت دونوں حاصل تھی- آپ بڑے زاہد، صائم الدہر، قائم اللیل درویش تھے- آپ

کے بارے میں آپ کے مرشد گرامی نے فرمایا: ''تم اور سید محمد جعفر کل اس فقیر کی نجات کے سبب ہو گے-'' آپ کے خاندان میں سجادگی کا سلسلہ اب تک جاری ہے-شاہ شاہد علی سبز پوش کے آپ مورث اعلیٰ ہیں-

(۲) حضرت شیخ محمد ارشد قدس سرہٗ (پ:۱۰۴۱ھ) آپ کا نام محمد ارشد، کنیت ابوالکشف اور لقب بدرالحق تھا- آپ قطب الاقطاب شیخ محمد رشید بانی سلسلۂ رشیدیہ کے منجھلے صاحب زادے اور سلسلۂ رشیدیہ کے پہلے سجادہ تھے- آپ نے علوم شرعیہ متداولہ شیخ عبدالشکور منیری، مولانا الہداد جون پوری، ملا نورالدین مداری جون پوری اور اپنے حقیقی چچا شیخ محمد ولید اور استاذ العلما شیخ محمد افضل جون پوری سے حاصل کی جب کہ کتب تصوف کا علم اپنے والد گرامی سے حاصل کیا- ۲۱ سال کی عمر میں ظاہری اور باطنی علوم سے آراستہ ہو چکے، پھر طالبان علوم نبویہ کی خدمت میں مصروف ہو گئے- ۲۲ رسال کی عمر میں اپنے والد کے دست مبارک پر سلسلۂ چشتیہ احمدیہ میں بیعت ہوئے اور انہی سے اجازت وخلافت بھی حاصل کی- ان کے بعد شیخ عبداللطیف مٹھن پوری جو سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہٗ کی اولاد سے تھے سلسلۂ جنیدیہ اور سلسلۂ چشتیہ اشرفیہ کی جازت وخلافت ہوئی -حضرت قطب الاقطاب کے آپ قابل فخر فرزند اور جانشین تھے-

(سمات الاخیار، ص: ۱۱۸/۱۱۹)

شیخ محمد ارشد ایک بار دہلی کے سفر پر تھے، لکھنؤ کے قریب سے گزر رہے تھے تو حضرت شاہ عبدالرزاق بانسوی نے حاضرین سے فرمایا کہ اس نواح میں ایک عاشق اللہ پہنچا ہے اور حضرت بدرالحق نے بھی اپنے ساتھیوں سے شاہ صاحب کے حق میں فرمایا کہ ان قصبات میں خدا کے دوست کی بوآ رہی ہے- (سمات الاخیار، ص: ۱۲۴ر، بحوالہ بحر ذخار)

شاعری کا ذوق رکھتے تھے- آپ کے چند کلام بھی ملتے ہیں- آپ شاعری میں بھی کمال رکھتے تھے- شاعری میں اپنا تخلص واؔلہ کرتے تھے-

(۳) حضرت سید محمد جعفر پٹوی قدس سرہٗ (م: ۳ر رمضان ۱۱۰۵ھ) آپ کا نام محمد جعفر اور لقب بحر الحقائق نجم الحق تھا- سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے- آپ جب آٹھ برس کے تھے تو آپ کے والد سید ابوالحسن نے وفات پائی- دادا نے پرورش کی اور سلسلۂ چشتیہ میں مرید کر کے خرقۂ خلافت دے کر اپنا جانشین بنایا- جب سن شعور کو پہنچے تو تحصیل علوم کے لیے جون پور آئے اور حضرت قطب الاقطاب (شیخ محمد رشید) کے مدرسہ میں مقیم ہوئے- تکملۂ علوم کے بعد چوں کہ پہلی بیعت صغر سنی کی وجہ سے ٹھیک یاد نہ تھی، حضرت سے سلسلۂ قادریہ میں مرید بھی ہو گئے اور چند دن خدمت میں رہ کر مرتبۂ کمالات کو پہنچے- اس کے علاوہ دیگر سلاسل مثلاً چشتیہ، سہروردیہ، فردوسیہ ومداریہ کی بھی خلافت واجازت حاصل کی اور بحکم شیخ پٹنہ میں قیام کیا- حضرت قطب الاقطاب نے میر سید نورالدین نبیرۂ حضرت سید فضل اللہ عرف سید گوشائیں دامادِ حضرت قطب بینا دل قلندر کی صاحب زادی سے نسبت مقرر کر کے آپ شادی کرادی- پھران سے مادرزاد ولی پیدا ہوئے- آپ عالم، عامل اور عارف کامل تھے- طریقۂ نبوی ہر امر میں ملحوظ رہتا-

آپ کا قول مشہور ہے: ''میں نے رشید (خدا) کو رشید کے سبب سے پہچانا- اگر رشید نہ ہوتے تو میں خدا کو نہ پہچانتا-'' آپ کا مرتبہ اسی سے روشن ہے کہ ایک بار حضرت قطب الاقطاب نے فرمایا تھا کہ ''قیامت کے دن مریدوں کو پیروں سے شفاعت کی امید ہوگی اور مجھ کو اپنے مرید میر سید جعفر پٹوی اور میر سید قیام الدین گورکھپوری سے-'' آپ نے رمضان المبارک ۱۱۰۵ھ کی تیسری تاریخ کو پنج شنبہ کے روز وصال فرمایا اور شریعت آباد بیرون شہر پٹنہ میں مدفون ہوئے-

(سمات الاخیار، ص: ۱۰۷ تا ۱۰۹)

(۴) حضرت شیخ یٰسین جھونسوی قدس سرہٗ (ولادت ۱۰۲۲ھ - وفات ۱۰۷۴ھ) آپ شیخ احمد ابن شیخ محمد جون پوری کے بیٹے تھے- چوں کہ آپ سعید ازلی تھے اس وجہ سے آپ کو بچپن ہی سے حضرت مخدوم طیب بنارسی کی صحبت نصیب ہوئی- حضرت مخدوم نے آپ کی پرورش اور تعلیم مربیانہ فرمائی- گیارہویں برس سلسلۂ چشتیہ میں مرید کر کے اپنا خلیفہ بنایا- شہاب الدین دولت آبادی ثم جون پوری کا رسالہ نحو ارشاد پڑھایا، پھر جون پور بھیجا- استاذ العلما شیخ افضل الہٰ آبادی اور حضرت قطب الاقطاب شیخ محمد رشید سے کتابیں پڑھیں- سات برس تک جون پور میں رہے- درمیان میں وقتاً فوقتاً حضرت مخدوم کی زیارت کو جا کر فیض یاب بھی ہوآتے تھے- بیسویں برس جمیع سلاسل کے خرقے اور خلافتیں حضرت مخدوم نے عطا کیے- حضرت مخدوم کے بعد جو کسر رہ گئی تھی حضرت دیوان جی شیخ محمد رشید نے پوری کردی اور خلافت واجازت بخشی - ان باتوں کے باوجود حضرت دیوان جی اپنے مرشد کے سجادہ نشین ہونے کی

وجہ سے آپ کی بڑی تعظیم کرتے تھے، یہاں تک کہ جب وہ قدم بوس ہونا چاہتے تھے تو آپ بھی اپنا ہاتھ ان کے پاؤں تک ضرور پہنچاتے تھے- آپ پر کشف کی حالت بہت طاری رہا کرتی تھی- آپ نے تصوف کے بہت سے مشکل مسائل بذریعہ تحریر پوچھے ہیں اور حضرت دیوان جی نے ان کے جواب میں مکتوب لکھے ہیں- اپنے پیرانِ سلاسل کے حالات میں 'مناقب العارفین' آپ کی عظیم تصنیف ہے- آپ کا وصال ۱۰۷۴ھ میں ہوا، مزار قصبہ جھونسی، الٰہ آباد میں شیخ نصیر الدین اسد العلما کے روضے کے اندر ہے- (سمات الاخیار، ص:۱۱۱/۱۱۲)

مشائخ سلسلۂ رشیدیہ کا اعتقادی، فقہی اور صوفی مسلک:

خانقاہ رشیدیہ ہندوستان کی قدیم روحانی اور علمی خانقاہ ہے- یہاں کے مشائخ نے اپنی علمی اور دعوتی دونوں حیثیتوں کو ثابت کیا اور ان دونوں میدانوں میں بے لوث خدمات انجام دیں- اس سلسلے کے مشائخ نے اعتقادی، فقہی اور سوانحی کتابیں بھی لکھی ہیں- خود بانی خانقاہ رشیدیہ شیخ محمد رشید قدس سرہ نے فن مناظرہ کی مشہور کتاب شریفیہ کی ''مناظرہ رشیدیہ'' کے نام سے جو شرح کی ہے وہ ان کے دینی افکار اور خیالات کو ثابت کرتی ہے- یوں ہی اس سلسلے کے مشائخ کی تصنیفات و تالیفات اور ملفوظات مثلاً: گنج رشیدی، گنج ارشدی، گنج فیاضی، کرامات فیاضی، مناقب العارفین، سمات الاخیار، عین المعارف، دیوان فانی وغیرہ کے مطالعے سے واضح طور پر جن افکار و نظریات اور خیالات کا علم ہوتا ہے اس کو ذیل میں قلم بند کیا جاتا ہے:

اعتقادی مسلک: ہندوستان کی دیگر خانقاہوں اور خانوادوں کے علما و مشائخ کی طرح سلسلۂ رشیدیہ کے علما و مشائخ اعتقادی طور پر حضرت امام ابو منصور ماتریدی قدس سرہ کے پیروکار رہے ہیں اور صدیوں سے متواتر طور پر چلے آرہے اہل سنت کے معتقدات و معمولات خواہ وہ ضروری ہوں یا ظنی، ان کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں-

فقہی مسلک: ہندوستان کی اکثر مسلم آبادی فقہ و فتاویٰ میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت قدس سرہ کی پیروی کرتی ہے- ہندوستانی علما و مشائخ نے فقہ حنفی کی صرف پیروی ہی نہ کی بلکہ وسیع پیمانے پر اس مسلک و مذہب کی ترویج و اشاعت بھی کی ہے- سلسلۂ رشیدیہ کے علما و مشائخ نے بھی دعوت و تبلیغ اور درس و تدریس کے ساتھ اپنی تصنیفات و تالیفات کے ذریعے بھی فقہ حنفی اور مسلک امام اعظم ابو حنیفہ قدس سرہ کی ترویج و اشاعت اور تبلیغ میں اپنے وجود کا احساس دلایا ہے-

صوفی مسلک: حضرت خواجہ غریب نواز قدس سرہ کی حکیمانہ دعوت و تبلیغ کی بنیاد پر چشتی نسبت نے قدیم ہندوستان کے اکثر حصوں کو اپنی روحانیت سے منور اور پرسکون بنا دیا- بہت سے دوسرے مشائخ نے قادریت، نقش بندیت اور سہروردیت کی بھی ترویج و تبلیغ کی اور ان تمام روحانی چشموں سے خود بھی فیض یاب ہوئے اور دوسروں کو بھی فیض یاب فرمایا- البتہ چشتیت اور قادریت کا غلبہ ہندوستان میں زیادہ رہا- خانقاہ رشیدیہ جون پور بھی اصلاً چشتی خانقاہ ہے، لیکن یہاں کے مشائخ کو دیگر مختلف سلاسل کی اجازت و خلافت شروع سے چلی آرہی ہے- یہاں کے اکثر مشائخ نے زیادہ تر بیعت، سلسلۂ چشتیہ اور قادریہ میں کی ہے اور اجازت سے نوازا ہے-

سلسلۂ رشیدیہ کی موجودہ علمی و دعوتی سرگرمیاں:

بانی سلسلۂ رشیدیہ شیخ محمد رشید جن کی عارفانہ حیثیت کو ان کے ہم عصر مشائخ و صوفیہ نے تسلیم کیا اور جن کے تبحر علمی کی مولانا شبلی نعمانی اور ان جیسے دیگر علما اور دانش وروں نے قصیدہ خوانی کی ہے، اس سلسلے کے مشائخ کی علمی اور روحانی حیثیتوں کو ملک العلما مولانا ظفر الدین بہاری جیسی عبقری شخصیات نے بھی تسلیم کیا اور ان کے ادبی اور شعری شہ پاروں کو دیکھ کر غالب اور ناسخ جیسے فن کار شعر و سخن نے رشک کیا ہے- اس عظیم خانقاہ کی علمی اور روحانی حیثیت آج بھی باقی ہے-

اس وقت ایک صاحب سجادہ کی نگرانی میں اس سلسلے کی پانچ خانقاہیں مختلف مقامات پر چل رہی ہیں- سب کے سب دعوت و تبلیغ اور خدمت خلق میں مصروف ہیں اور اپنے مشائخ کے نقش قدم پر عمل کرتے ہوئے اشاعت علم و معرفت کا سلسلہ جاری رکھی ہوئی ہیں- یہاں کے موجودہ صاحب سجادہ حضرت مفتی عبید الرحمٰن رشیدی کی لائق تعریف اور حکیمانہ قیادت میں مختلف مقامات پر اس سلسلے کے ترجمان مختلف معیاری علمی ادارے چل رہے ہیں جہاں سیکڑوں کی تعداد میں طالبان علوم نبویہ اپنی علمی تشنگی بجھا رہے ہیں- ان چند ادارے یہ ہیں: (۱) دارالعلوم مصطفائیہ، چمنی بازار، پورنیہ، بہار (۲) دارالعلوم سرکار آسی، سکندر پور، بلیا (۳) دار العلوم طیبیہ معینیہ، بنارس (۴) دارالعلوم رشیدیہ، جون پور (۵) دارالعلوم حیدریہ معینیہ، سیوان (۶) دارالعلوم علیمیہ شاہدیہ، غازی پور- □□□

☆استاذ: جامعہ عارفیہ، خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد (یوپی)

اسٹار اسلامک بک ورلڈ، پٹنہ کی فخریہ پیشکش، ڈاکٹر مفتی امجد رضا امجدؔ کی مخلصانہ جدو جہد کا حسین گلدستہ !!
اردو میں ۳۰ رجلدوں پر مشتمل فقہ حنفی کا انسائیکلوپیڈیا
اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کا بے مثل فقہی کارنامہ
فتاویٰ رضویہ اب صرف ایک جلد میں
بنام
مُنتخب مسائِل
فتاویٰ رِضویّہ
کا دوسرا ایڈیشن مع اضافہ وترتیب جدید شائع ہو کر منظر عام پر!
عوامی ضرورت کے پیش نظر!! عوامی معیارِ فہم کے مطابق!! مشکل الفاظ کے معانی!!
عوامی مسائل کا گراں قدر انتخاب!! مشکل عبارات کا سلیس اُردو ترجمہ !!
جدید کمپوزنگ، اور مشکل الفاظ کی تسہیل کے ساتھ اور روزانہ پیش آنے والے مسائل کی الجھنوں کو دور کر دینے والی
اس مستند اور علمی کتاب کو حاصل کرنے کے لئے آج ہی آرڈر بک کرائیں، اسٹاک محدود ہے!
نوٹ: تاجرانِ کتب اور مدارس اسلامیہ کے طلباء کیلئے مخصوص رعایت کا انتظام ہے۔
احمد رضا صابری ہیرا کامپلیکس، قطب الدین لین متصل دریاپور مسجد، سبزی باغ، پٹنہ ۴
Near Dariyapur Masjid, Qutubuddin Lane Sabzibagh, Patna-4,
Mob.: 08521889323, 9973362000، E-mail.: ahmadrazasabri@gmail.com
اسٹار اِسلامک بُک ورلڈ
STAR ISLAMIC BOOK WORLD